حیاتِ اشرف

یعنی

محترمہ بی بی اشرف النساء بیگم کی زندگی
کے حالات

*

جسے

محترمہ محمدی بیگم مرحومہ نے
لڑکیوں کے فائدے کے لیے مرتب کیا

*

ناشرین:
امامبارہ سیدہ مبارک بیگم (مرحومہ مغفورہ)
بازار حکیماں - لاہور

پیش لفظ

لاہور کی قدیم تہذیب کی دلکش تاریخ محتاج توجہ ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کے دقیع روایات جاننے والے اللہ کو پیارے ہو چکے، اس گہوارۂ علم و ادب نے کیسے کیسے فرزندان وطن کو جنم دیا۔ اس شہر مینو چہر میں کیسی کیسی باوقار مائیں رہتی تھیں، اسے اب کون بتلائے۔ خوش قسمتی سے کم و بیش ایک صدی پہلے کی تاریخ کا ایک صاف و شفاف بے داغ صفحہ موجود ہے۔ یہ صفحہ ایک پاک نہاد، نیک صفات خاتون کی سادی اور غیر شاعرانہ سوانح عمری کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔

سیدہ اشرف النساء بیگم صاحبہ، لاہور کی تعلیم نسواں تحریک کی خاموش قائد، مسلمان بچیوں کی ذہنی و اخلاقی تربیت کرنے والی بلند مرتبہ استانی، اسلامی سیرت و کردار کی مثالی خاتون، جنہیں لاہور کے باعزت مرد و زن ادب و احترام سے بلبو صاحبہ یا استانی جی کہتے تھے۔ اتفاق کہئیے یا بلبو صاحبہ کی شخصیت کی مقناطیسی قوت کا اثر کہ ان کو محمدی بیگم صاحبہ اڈیٹر تہذیب نسواں، لاہور کا قلم اور پرمحبت دل و دماغ مل گیا۔ محمدی بیگم صاحبہ نے استانی جی کی زندگی اس قدر دلکش اور اثر انگیز انداز سے لکھی کہ پڑھنے والے کے سامنے ایک سفید، نورانی متحرک جیتی جاگتی تصویر سی گھومنے آجاتی ہے۔ اور اپنی سیرت کی چھاپ دل پر لگا جاتی ہے۔

اب سے تیس چالیس سال پہلے، جب بزرگوں کی قدر تھی اور اللہ والوں سے محبت کا چرچا عام تھا "حیات اشرف" شریف گھرانوں میں لڑکیوں کے جہیز میں دی جاتی تھی اور مائیں بچیوں کو سبقاً سبقاً پڑھاتی تھیں۔ میں سمجھتا ہوں آج بھی یہ ضرورت باقی ہے اتنی سہل اور رواں زبان میں، اتنی نفیس زندگی کی سچی کہانی جو خاتون بھی پڑھیں گی وہ یقیناً لطف اندوز بھی ہونگی اور سبق بھی لیں گی۔ اللہ سب کو ایسا ہی بنا دے۔

سید مرتضیٰ حسین، فاضل

پیش گفتار

اگر پندے ز درویشے پذیری
ہزار امت بمیرد، تو نہ میری
بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیری

★

تاریخِ عالم آج تک کوئی ایسی مثال نہیں پیش کر سکی جہاں ماں، بیٹی اور نواسی نے عورت کو حسنِ اخلاق و کردار کی ایسی عظیم منزل پر پہنچا دیا ہو کہ پیغمبر بھی عش عش کریں اور فرشتے بے اختیار پکار اُٹھیں کہ "اے پروردگار! ہماری خطا معاف کر دے کہ تو غفور و رحیم ہے اور ہم نہیں جانتے تھے جو تو جانتا تھا کہ حضرتِ آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے تین ایسی مخدراتِ قدسی صفات ظہور میں آئیں گی جن کی زندگیاں عورت کے مقام کو عظمتِ انسانی کی انتہائی بلندی پر پہنچا دیں گی،

ایسی بلندی جو تیری تمام مخلوق کے تصور کی حد سے بھی اُونچی ہے۔

میں اس کتاب کو حضرتِ خدیجہ، حضرتِ زہرا اور حضرتِ زینب سلام اللہ علیہن کی خدمت بابرکت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں کیونکہ محترمہ و مرحومہ اشرف النساء بیگم نے اُن ہی کی ضیاء کی ایک کرن سے اپنی زندگی کو روشن کیا تھا اور یہی روشنی تو قوموں کے معراج اور تابندگی کی محافظ ہوتی ہے۔ خدا کرے ایسی کلیاں اس گلستانِ خزاں منظر میں پھر ظہور پذیر ہو جائیں۔

سید آل علی

یکم رمضان المبارک ۱۳۹۸ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نسب-خاندان

بی بی اشرف النساء بیگم کے بزرگ ساداتِ بخاری سے تھے جن کا شجرۂ نسب امام الہادی حضرت علی نقی ؑ امام دہم پر ختم ہوتا ہے۔ شاہانِ مغلیہ کے وقت وہ ہندوستان میں آئے اور انھی کے عہد میں انھوں نے بڑے بڑے عہدے اور منصب پائے۔ اکبر کے عہد میں سیّد حامد بخاری دو ہزاری منصب پر ممتاز تھے اور شاہی سرکار سے انھیں اور اُن کی اولاد کو جاگیریں اور شاہی خطاب حاصل تھے۔ چنانچہ جس محلّہ میں ان کا خاندان آباد تھا وہ محلّہ آج تک سرداروں کے محلّے کے نام سے مشہور چلا آتا ہے۔ پچھلے گئے گزرے زمانے میں بھی شاہ علم الدّین جو بی اشرف کے پردادا تھے۔ بڑے نام و نمود کے بزرگ اور بڑے مقدّس، عابد، زاہد آدمی تھے لوگ اُس زمانے میں اُن کو ولی سمجھتے تھے اور بہت سی کراماتیں اور خوارق عادات اُن کی مشہور ہیں۔ عبادات کے لیے انھوں نے ایک خاص عمارت قصبہ سے

باہر بنوائی تھی۔ جوتکیہ کے نام سے آج تک مشہور رہے اور سرداروں کی میتیں اکثر اسی جگہ دفن ہوتی ہیں۔ اسی میں شاہ صاحب رہتے تھے۔ ساٹھ ستّر فقراء و مساکین اور آئے گئے کو روز اُن کے لنگر خانے سے کھانا ملتا تھا۔ ہفتہ میں ایک دن وہ گھر اپنی والدۂ ماجدہ کی زیارت کو آتے تھے اور قصبہ کے عورت و مرد اُن سے فیض پاتے تھے۔

بی اشرف کے دادا صاحب کے زمانے میں بھی خاصی چہل پہل تھی۔ مگر آخر اُن کی فیاضی اور بعض اوقات کے اسراف نے پس ماندوں کو عُسرت کی نوبت کو پہنچا دیا۔ ان سب سرداریوں اور منصب داریوں کے مِٹ جانے پر بھی بی اشرف کے والد فتح حسین بہنیڑا ضلع بجنور کے اچھے خوش حال رئیس تھے۔ اُنھوں نے علوم مروّجہ میں پُوری تعلیم پائی تھی۔ بعد تکمیل علوم اُن کے دل میں خیالِ سیاحت پیدا ہُوا اور اُنھوں نے والد مرحوم سے باہر جانے کی اجازت مانگی۔ چنانچہ اُنھوں نے اُن کی لیاقت اور طبع سلیم اور خوش اطواری پر بھروسہ کر کے اُن کو خوشی سے اجازت دے دی۔ خدا کے فضل سے جس جس شہر میں گئے۔ اپنے خُلق و مروّت اور کمال کے سبب سے وہاں کے لوگوں کی نظروں میں عزیز ہو گئے اور بڑی عزّت و آبرو سے رہے۔ آگرے میں کچھ دن زیادہ قیام رہا اور بطورِ تفریح ایک سرکاری ملازمت بھی کر لی۔ اُن کی کارگزاری اور دیانت داری کے سبب سے حکّام اُن سے بہت خوش رہے۔ کچھ عرصے بعد ملازمت چھوڑ کر قانون کی طرف توجّہ کی اور اس میں بھی واقفیت پیدا کر کے وکالت کا کام شروع کیا۔

شروع شروع میں لوگوں کے مقدمے بے اُجرت مختانہ کرتے رہے۔

میر صاحب کے وکیل بننے کی خبر جب ان کے والد مرحوم کو پہنچی تو سخت صدمہ ہُوا اور کئی وقت تک کھانا نہ کھایا۔ لوگ مبارک باد دیتے تھے تو وُہ فرماتے تھے کہ یہ مقام تعزیت کا ہے تہنیت کا نہیں۔ خُدا نے ہمیں اتنا دے رکھا ہے کہ دس آدمی ہمارے ملازم ہیں افسوس کہ اس لڑکے نے ہمارے خاندان کو بٹّہ لگایا۔

ولادت اور تربیت و تعلیم

بی بی اشرف النّساء بروز شنبہ غُرّہ شعبان ۱۲۵۶ھ ہجری مطابق ۲۸ ستمبر ۱۸۴۰ء غدر سے سترہ برس پہلے پیدا ہوئیں۔ اُن کا بچپن کا زمانہ کسی قسم کی دلچسپی یا خوشی کا زمانہ نہ تھا۔ کیونکہ آٹھواں سال ختم ہی ہُوا تھا کہ اپنی پیاری ماں کی کنار عاطفت سے محروم ہوگئیں۔ اب اُن کی پرورش چچا اور چچی کے سُپرد ہُوئی۔ کیونکہ اُن کے والد گوالیار میں تھے اُن کے چچا کو اُن سے اور اُن کے بھائی سے بہت محبّت تھی مگر چچی کا مزاج ذرا سخت تھا اور اس سبب سے ان بے ماں کے بچّوں کی جس قدر بزرگ داشت ہونی چاہیے تھی اُس قدر نہ ہُوئی۔ بی اشرف نے تو اس زمانے کے حالات کبھی ہم سے بیان نہیں کیے۔ لیکن اور ذریعوں سے ہمیں بعض قصّے ان بدسلوکیوں کے جوان بچّوں سے ہوئیں معلوم ہوتے ہیں۔ مگر اب کہ نہ وہ خود ہیں اور نہ وہ بدسلوکی والے رہے ان قصّوں کا ذکر کرنا فضول اور

موجب طول ہے۔

بی اشرف کی دادی ان تکلیفوں میں اُن کی شریک حال رہیں اور انھیں کے دم سے اُن کی اور اُن کے بھائی کی پرورش ہوگئی۔

گھر کے اندرونی حالات کی خبر مردوں کو کم ہوتی ہے اور اس قسم کی باتیں قصداً اُن سے چھپائی جاتی ہیں پس اس صورت میں جو تکلیفیں اُن صغیر بچوں کو پہنچیں اُن کے ذمّے دار اُن کے چچا نہیں ہو سکتے۔

ماں کے مرنے سے لے کر شادی کے وقت تک بی اشرف کا زمانہ نہایت روکھا پھیکا اور اُداس زمانہ تھا۔

چونکہ سرپرستوں میں صرف ایک دادی ہی کا دم تھا اور اُن کے سوا کوئی اور عزیز دل جوئی اور دل داری کرنے والا نہ تھا اس لیے اُن کے دل میں بچوں کی سی باتیں اور بچوں کی سی امنگیں نہ تھیں دل ہر وقت کملایا اور مرجھایا رہتا تھا۔ کھیلنے کودنے اور بچوں کی خوشیوں میں شریک ہونے کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سارے بھرے کنبے میں دو چار ہی لڑکیاں تھیں۔ جو درحقیقت ان کی سہیلیاں کہی جا سکتی ہیں جن میں سے ایک اب بھی خدا کے فضل سے زندہ ہیں۔ اللہ انھیں سلامت رکھے۔ وہ بھی بہت نیک بھولی پرہیزگار ہیں۔

جس زمانے میں بی اشرف پیدا ہوئیں اُس زمانے میں شرفاء کی مستورات میں آج کل کی تعلیم کا بالکل چرچا نہ تھا۔ تھوڑی بہت توجہ تھی بھی تو قرآن شریف اور مسئلے مسائل کی اُردو کتابوں پر تھی۔ مثلاً تحفۂ جعفری۔ رسالہ صفدریہ۔ تحفۃ العوام یا مرثیے وغیرہ کی کتابیں۔ چنانچہ بی اشرف کی والدہ نے

بھی اسی قسم کی تعلیم پائی تھی اور بیٹی کو بھی اسی قسم کی تعلیم دلوانے کی تجویز کی گئی۔

بی اشرف نے کیا تعلیم پائی اور کس طرح پائی؟ اس کی تفصیل کے لیے اس سے بہتر نہیں ہو سکتا کہ جو حال اپنی نوشت و خواند کا انہوں نے خود اپنی قلم سے لکھا ہے وہ بجنسہ یہاں درج کر دیا جائے۔ وہ لکھتی ہیں۔

ہمارے خاندان میں لڑکیوں کے پڑھانے کی رسم تو قدیم سے چلی آتی ہے مگر لکھنے کی سخت مخالفت رہی۔ لڑکیوں کو صرف قرآن شریف اور اُردو پڑھاتے تھے کہ جس کے ذریعے سے وہ نماز روزہ اور اپنے دین سے خبردار ہو جائیں اور ہم چھوٹی بڑی چھ لڑکیاں ایک کنبے کی تھیں۔ ہمارے دادا صاحب نے خدا ان کو جنت نصیب کرے۔ ہمارے واسطے ایک اُستانی دس روپیہ ماہوار اور کھانے کپڑے پر مقرر کی۔ تین لڑکیاں بڑی تھیں اور ایک ماما کی لڑکی اُنھوں نے قرآن شریف ختم کیا تھا۔ اور میرا ساتواں سپارہ شروع تھا اور دو لڑکیوں کا آٹھواں سپارہ تھا۔ ہماری برادری میں سے بیس پچیس لڑکیاں اور داخل ہو گئی تھیں۔ غرض خاصہ مکتب جمع ہو گیا تھا۔ مگر ہماری اُستانی صاحبہ کو خدا جنت نصیب کرے۔ اُردو نہیں آتی تھی اور قوم سے شریف خاندان پٹھان کی لڑکی تھیں۔ اُردو کے واسطے اُستانی کی بہت تلاش کی مگر کوئی نہ ملی۔

ہنڈکلھیا:۔

ہماری اُستانی صاحبہ ہم کو جمعہ کے روز چھٹی دیا کرتی تھیں۔ مجھ کو خوب یاد ہے۔ کہ سب لڑکیاں اُس روز آٹا اور چاول اور پیسے اپنے گھر سے

لایا کرتی تھیں اور اُستانی صاحبہ کو دیا کرتی تھیں اور جو استانی صاحبہ فرماتی تھیں۔ سب لڑکیاں مل کر پکاتی تھیں۔ روٹی اور قورمہ اور کباب تو ہمیشہ پکواتی تھیں اور اس کے ساتھ کبھی پلاؤ کبھی زردہ کبھی فرنی۔ کبھی پکوان کسی قسم کا۔ اور بھی کئی طرح کے کھانے پکواتی تھیں اور سلائی کا کام بھی سکھاتیں میری عمر بہت چھوٹی تھی اس واسطے مجھ سے آسان آسان کام لیا کرتی تھیں۔ مگر مجھ کو چھوٹی سی عمر سے ہی ہر ایک کام کے کرنے کا نہایت شوق تھا اس لیے ہر کام کو نظر میں رکھتی اور اپنی بساط سے بڑھ کر کرتی تھی۔

اُستانی کا نکاح:۔

کئی سال تک ہماری اُستانی لڑکیوں کو نہایت محبت اور مہربانی سے پڑھاتی رہیں۔ اس عرصے میں انہوں نے کبھی چھٹی نہیں لی تھی۔ ایک روز اُن کی امّاں جان آئیں اور کہا کہ میری لڑکی کو پندرہ روز کی رُخصت مل جائے تو بڑی مہربانی ہو مجھ کو کوئی ضروری کام ہے۔ غرض پندرہ روز کی رُخصت لے کر گھر گئیں اور ایک سیّد کے ساتھ اُن کا نکاح کر دیا۔ سُنا ہے کہ اُستانی صاحبہ گیارہ سال کی تھیں جب اُن کی پہلی شادی ہوئی۔ پندرہ سال کی تھیں جب بیوہ ہو گئیں اور بارہ سال کے بعد پھر ان کا نکاح ہُوا اس عرصے میں نہایت شرم و حیا کے ساتھ گزاری۔ خدا غریق رحمت کرے بڑی نیک بخت اور پرہیز گار تھیں اور نماز روزوں کی پابند مرتے دم تک رہیں اور یہ حقّ شرع جو اُن سے ہُوا تو اُن کی خوشی سے نہیں ہُوا۔ بلکہ اُن کی امّاں صاحبہ

کے جبر سے ہُوا۔

یہ بھی خدانخواستہ کوئی ایسا سخت گُناہ انہوں نے نہیں کیا تھا کہ جس کے سبب سے کسی سے ملنے اور منہ دکھانے کے لائق نہ رہیں۔

نکاح ثانی کا صدمہ

مگر جس وقت ہمارے دادا صاحب کو یہ خبر ہوئی تو اُن کو نہایت رنج اور صدمہ ہُوا اور ایک مہینہ شرم کے مارے گھر سے باہر نہ نکلے ہر چند اُن کو سب نے سمجھایا کہ آپ کس واسطے اس قدر رنج کرتے ہیں وہ آپ کے گھر کی اُستانی تھی خُدانخواستہ کوئی کنبے برادری میں سے تو نہیں تھی اُس کا یہ جواب دیتے کہ وہ ہماری لڑکیوں کی اُستانی تو تھی مجھ کو اس کی نہایت غیرت آتی ہے۔ کہ ہماری لڑکیوں کی اُستانی ہوکر دُوسرا نکاح کرے۔ جس وقت یہ خیال آتا ہے تو جی نہیں چاہتا کہ کسی کو منہ دکھاؤں جس سیّد کے ساتھ اُن کا نکاح ہُوا تھا، اُس سے ملنا ترک کیا اور جب تک زندہ رہے۔ اُس سے نہ ملے اور اُستانی صاحبہ کو ممانعت کردی کہ خبردار جو ہمارے دروازے پر قدم رکھا۔ اس کو سُن کر سب لڑکیوں کو نہایت صدمہ ہُوا اور اُستانی صاحبہ کو تو لڑکیوں کی جُدائی کا کمال ہی رنج ہُوا۔ کیونکہ اُنکو سب لڑکیوں سے نہایت محبّت تھی اور لڑکیوں کو اُن سے اگر ایک دن اُستانی صاحبہ کو نہیں دیکھتی تھیں تو چین نہیں آتا تھا مجبوراً صبر کیا مگر اُن کی جُدائی سے دل نہایت بے قرار رہتا تھا۔

پھر سب کی یہ صلاح ہوئی کہ ایسی اُستانی رکھی جائے جو قرآن شریف اور اُردو جانتی ہو۔ مگر میرے دادا صاحب مرحوم نے ہرگز منظور نہ کیا اور یہی کہا کہ اب میرا دل گوارا نہیں کرتا کہ غیر عورت کو لڑکیوں کی تعلیم کے لیے رکھا جائے مجھ کو یہ امر ہرگز منظور نہیں اس تعلیم سے بہتر یہ ہے کہ لڑکیاں جاہل رہیں۔

ہمارا لکھنا پڑھنا بند کیا گیا:۔

شرم و حیا اُن کی سیرت کا ایک لازمی جزو تھا اس قدر کہ لڑکی اپنے باپ بھائی سے بھی کلام نہ کرے۔ وہ فرماتے تھے کہ اس سے لڑکیاں بدلحاظ ہو جاتی ہیں۔ بھلا پھر پڑھنا مردوں سے کہاں تھا؟

سادات میں بہت سی غریب اور بیوہ عورتیں پڑھی ہوتی تھیں مگر اُن کو پڑھانے کے واسطے کہنے کی کسی کو جرأت نہ ہوئی۔ غرض اس طرح پڑھنا سب لڑکیوں کا ترک ہو گیا۔ اور لڑکیوں نے تو اپنی ماؤں سے پڑھنا شروع کر دیا مگر میری بدقسمتی سے میری اماں جان بیمار ہو گئیں اُس وقت میری عمر سات آٹھ سال کی تھی اور میرا بھائی خدا رکھے چھ مہینے کا تھا۔ میری اماں جان کو میرے نہ پڑھنے کا اپنی بیماری سے زیادہ صدمہ تھا مگر کچھ پیش نہیں چلتی تھی۔ میری اماں جان مرثیے خوان کی بیٹی تھیں اور خود بھی مرثیے خواں تھیں۔ اس بیماری کی حالت میں مجھ کو زبانی مجرے سلام سکھاتے۔ افسوس ہزار افسوس کہ زندگی نے وفا نہ کی اور ہم کو صغیر سنی کے عالم میں یتیم کر گئیں۔

ماں کی وفات

خدا کسی بچّہ کے سر سے والدین کا سایہ نہ اُٹھائے۔ ایک سال بیماری میں مبتلا ہو کر قضا کی۔ مجھ کو یہ پہلا داغ اور صدمہ تھا۔ جو اماں صاحبہ کی وفات سے نصیب ہوا۔ بعد اس کے جو جو حادثے اور اپنے عزیزوں کے صدمے وطن سے لے کر پردیس کی غربت میں مجھ پر گزرے اس کے بیان کی طاقت زبان کو اور تحریر کی طاقت قلم کو نہیں۔ سوائے صبر اور شکر کے انسان کو کوئی چارہ نہیں۔ جو ہُوا بہتر ہُوا اور جس میں اُس پیدا کرنے والے کی خوشی اور مرضی ہے۔ اس پر میں راضی ہوں۔

مجھ کو اماں جان کی وفات کا اس قدر رنج اور صدمہ ہُوا کہ تحریر سے باہر ہے۔ دن رات ان کو یاد کر کے اور جہاں جہاں اُن کے بیٹھنے اور سونے اور نماز کی جگہ تھی وہاں جا جا کر خوب رویا کرتی تھی اور جس روز مجلس ہوتی اُس روز تو تمام دن اُن کو رو رو کر گزارتی۔ اس سبب سے کہ اگر میری اماں ہوتیں تو آج وہ بھی مرثیے پڑھتیں ان دنوں میں مجھ کو یہ سبب کم سنی کے اس قدر سمجھ نہیں تھی جو میں جناب امام حسین علیہ السّلام اور اہلبیتؑ کی مصیبت پر روتی کیونکہ مجھ کو اپنے سے زیادہ کوئی مصیبت زدہ نظر نہیں آتا تھا۔

ناسمجھی کی مثال:

ناسمجھی کا میرے یہ حال تھا، کہ کئی سال تک اُن کے زندہ ہونے کے واسطے نماز میں دُعائیں مانگتی اور اسم پڑھتی رہی اور دل میں یہی یقین تھا کہ خدا تعالےٰ

ان اسموں اور دُعاؤں کی برکت سے ضرور اُن کو زندہ کردے گا اور میرا بھائی جس کو اماں جان نے ڈیڑھ سال کا چھوڑا تھا۔ اُس کو بھی میں نے یہی سکھایا تھا۔ کہ دُعا مانگ "اللہ اماں آجائے۔ اللہ اماں آجائے"۔ وہ تمام دن ننھے ننھے ہاتھ اُٹھا کر یہی کہتا تھا "اللہ اماں آجائے۔ اللہ اماں آجائے"۔ غرض جس کی گود میں جاتا اُس سے بھی یہی کہلواتا۔ اگر کوئی نہ کہتا تو بہت ضد کرتا اور روتا۔ اور اگر کوئی اُس کے کہنے سے کہتا تو بہت خوش ہوتا۔ اُس کے کہنے سے غیروں کے دل بھر آتے۔ آہ! میری نظروں میں اب بھی وہ زمانہ پھر گیا اور دل بے تاب ہوگیا ہے۔

مُردہ پر رونا منع ہے:۔

غرض میرے رونے کی عجیب کیفیت تھی۔ نہ دن کو چین تھا نہ رات کو نیند۔ جب میری اماں کا چالیسواں گزر گیا اور وہ برادری کی مستورات اور مہمانوں کی آمد شد موقوف ہوگئی اور میرا رونا کسی طرح نہ چھوٹا تو میری دادی صاحبہ نے ہر روز مجھ کو مسئلے مسائلوں کی باتیں سُنانی شروع کیں اور یہ کہا کہ اے بیٹی لڑکیوں کو امام حسین علیہ السلام کے غم میں رونے سے ثواب ملتا ہے اور اگر ماں باپ، بہن بھائی یا اپنے عزیزوں کے غم میں روئے تو بڑا گناہ ہے اور خدا ناراض ہوتا ہے اور مرنے والے کو اس سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ اب تم بھی ہر وقت کا رونا چھوڑ دو اگر تمہارے رونے کا یہی حال ہے تو یقین جانو۔ تمہاری اماں جان بہت تکلیف پائیں گی اور تم سے ناراض ہوجائینگی۔

اگر تمہیں یہ منظور ہے کہ تمہاری امّاں جان تم سے خوش رہیں تو اس سے بہتر کوئی نہیں کہ ان کے واسطے کچھ پڑھ کر اُن کو بخشو۔

میں نے کہا۔ کیا بخشوں اور کس طرح بخشوں؟ انہوں نے فرمایا کہ تم نے جو سات سیپارے پڑھے ہیں۔ اُن کو ہر روز پڑھ کر خدا کی جناب میں ہاتھ اُٹھا کر یُوں کہا کرو کہ میں نے اس کا ثواب اپنی امّاں کی رُوح کو بخشا اس سے ان کی رُوح تم سے خوش ہوگی۔ اس روز سے مَیں نے اُن سیپاروں کا ورد کر لیا اور ایک ایک سیپارہ کئی کئی مرتبہ پڑھکر بخشا۔ مجھ کو اُس ورد سے پڑھنے کی بھی خوب اٹکل ہوگئی اور پھر خود ہی سبق نکال لیا کرتی اور پڑھ پڑھ کر یاد کر لیا کرتی اس طرح ایک سال میں خدا کی رحمت اور اپنے شوق سے قرآن شریف تو پڑھ کر ختم کیا اور مجلس امام حسین علیہ السلام کی کرائی مگر اُردُو کے واسطے دل بیقرار تھا۔ کوئی پڑھانے والی دستیاب نہ ہوئی۔

اُردو پڑھنے کا شوق کیونکر ہُوا:۔

اُردو پڑھنے کا شوق مجھ کو اس واسطے ہوا کہ ہمارے یہاں محرّم میں چالیس روز مردانی اور زنانی مجلسیں ہوتی تھیں اور ہر جمعرات کو کسی نے مَنّت مرادمانی تو وہ علاوہ۔ مَیں نے اس شوق سے چاہا۔ کہ کسی طرح مجھ کو اُردُو آجائے۔ ہمارے سب کنبے کی بیبیاں اُردو بخوبی جانتی تھیں جب کسی شادی یا غمی میں کہیں جانے کا اتفاق ہوتا یا اپنے گھر کسی تقریب سے عورتیں جمع ہوتیں تو اُن کو مسئلے مسائل کی کتابیں سُنایا کرتی تھیں مجھ کو اگرچہ اس طرح سُنتے سُنتے بغیر پڑھائے

بہت سی باتیں مسئلوں کی بطور قصّے کہانیوں کے یاد ہوگئیں۔ مگر بے اختیار دل یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح مجھ کو یہ نعمت نصیب ہو۔

اس شوق پر جھڑکیاں پڑیں:۔

ایک دفعہ میں نے اپنے کنبے میں ایک ایک کی منّتیں اور خوشامدیں کیں کہ مجھ کو اگر ایک ایک دو دو حروف بتا دیا کرو۔ تو میں تمہاری لونڈی ہو جاؤں گی۔ میری اس عاجزی اور منّتوں پر بھی کسی کو رحم نہ آیا اور سب نے یہی جواب دیا کہ لڑکی دیوانی تو نہیں ہوگئی؟ اپنے اس دیوانہ پن کا علاج کرا اوّل تو یہ بتا کہ تو پڑھ کر کیا کرے گی؟ اور دوسرے پڑھنا پڑھانا کیا سہل کام ہے جو کوئی تجھ کو بتا دے؟ یہ امر نہایت مشکل اور دشوار ہے۔ کون تیرے ساتھ اپنا سر کھپائے گا۔

میں ان کے جواب سے بے آس ہو کر رونے لگی اور ایسی بے تاب ہو کر روئی کہ میری آواز نکل گئی پھر تو وہ اَور بھی میرے اُوپر خفا ہوئیں کہ یہ تو خوب ہُوا تو ہم کو رو کر ڈراتی ہے۔ تیرے اس بیہودہ رونے سے یہاں کوئی نہیں ڈرتا۔ پڑھنے کے واسطے اس قدر ہر وقت کا رونا اچھا نہیں ہوتا۔ ایسی لڑکی تو آج تک دیکھنے میں نہیں آئی۔ لڑکیاں پڑھنے کے نام سے بھاگتی ہیں۔ اس عمر کے بچّے پڑھنے کے واسطے ماریں کھاتے ہیں سزائیں پاتے ہیں اور تو برخلاف اس کے روتی ہے۔ اس پڑھنے کے پیچھے رو رو کر اماں سے تو ہاتھ دھو بیٹھی۔ اب نہیں معلوم کیا انجام ہونا ہے۔ میرے پاس بیٹھ کر نہ رو۔ مجھ کو وہم ہوتا ہے۔

ان کے اس کہنے سے اَور زیادہ دل بھر آیا۔ جب انہوں نے میرے رونے

کا یہ حال دیکھا تو کہا لڑکی! برائے خدا میرے پاس سے چلی جا اگر تیری دادی دیکھ لیں گی تو کہیں گی۔ میری چہیتی لڑکی کو کچھ ایسا ہی سخت کہا ہوگا جو روتی ہے ان کے اس اتنا ہی کہنے سے جو میرے دل کا حال ہُوا میرے خدا پر خوب روشن ہے کیونکہ مجھ کو میرے والدین نے بڑے ناز کے ساتھ رکھا تھا اور نہ میرے سامنے کبھی کسی سے گھُرکی اور سختی سے پیش آئے۔ ہر ایک کے ساتھ حلیمی اور اخلاق سے گفتگو کرتے اس سبب سے میں ایسی باتوں کی عادی نہیں تھی۔

خدا سے عہد لڑکیوں کے پڑھانے کا

ان کے کہنے نے زخمی دل پر اَور نمک چھڑک دیا اور آنسو پونچھ کر اُن کے حکم کی تعمیل کر کے چلی آئی اور اپنے خدا سے دُعا مانگی کہ اے خداوند کریم میرے حال زار پر رحم کر اور اس دشوار گھاٹی سے مجھ کو اُتار دے اگر مجھ کو یہ نعمت حاصل ہو جائے تو میں جو اس کی خواہش کرے اُس کو اور جو نہ کرے اُس کو بھی انشاءاللہ جبر سے پڑھاؤں گی کیونکہ مجھ کو یہ اپنی بیقراری تا زیست نہیں بھولے گی۔

ایک رات مجھ کو اسی تصور میں یہ خیال ہُوا اگر میرے پاس کوئی مرثیہ یا مجرا اسلام ہو۔ تو میں آپ جوڑ کر کے پڑھ لوں۔ صرف تو مجھ کو آتے ہی ہیں کون سی بڑی بات ہے۔ پڑا کوئی نہ پڑھائے۔ اس خیال سے دل کو ایسی تقویت اور اُمید ہوگئی اور صبح کو اپنی سہیلیوں کے پاس ماما کو بھیجا کہ مجھ کو چند مجرے سلاموں کی ضرورت ہے برائے مہربانی عنایت کریں نقل کرا کر بھیج دوں گی۔ خدا ان کو خوش رکھے سب نے بھیج دیے۔

مگر لکھنے والا کون تھا؟ یہ تو صرف ایک بہانہ تھا اس بہانے سے

دادی صاحبہ سے کہا کہ مجھ کو کاغذ منگا دو۔ تو میں اپنے ماموں صاحب سے مجرے سلاموں کی نقل کراؤں گی۔ انہوں نے اُسی وقت کاغذ منگا دیے اب یہ سوچ ہوئی کہ کس طرح اس کی نقل کروں اور کہاں جا کر کروں۔ اگر میرے لکھنے کی کسی کو ذرا بھی خبر ہو گئی تو ابھی میری شامت آ جائے گی۔ اپنی ماں تو نہیں جو چھپا لیں گی اور لکھنے کی سخت ممانعت ہے کیا تدبیر کروں کہ جس سے میرا مطلب بھی نکل آتے اور کسی پر ظاہر بھی نہ ہو۔ چچی صاحبہ تو قرآن شریف کے پڑھنے پر ہزاروں باتیں سناتی ہیں اور کہتی ہیں کہ شکر ہے جو اور کچھ نہ آیا نہیں تو اسی کی ہو رہتی۔ لکھنے پر کیا کچھ نہ کہیں گی۔

عجیب دوات وقلم

سیاہی کی روشنائی

آخر سوچتے سوچتے یہ جی میں آیا کہ جب دوپہر کو سب سو جائیں گے تو توے کی ~~[illegible]~~ بنا کر ان کی نقل کروں گی۔ غرض وہی کیا۔ یقین جانو اس میں سر مو فرق نہیں۔ توے کی سیاہی اور گھڑے کی سکوری اور جھاڑوں کی سینکیں لے کر سونے کے بہانے سے محل پر گئی اور خوشی خوشی نقل کرنی شروع کر دی۔ اُس وقت کی خوشی تحریر سے باہر ہے۔ لڑکپن کا زمانہ کیا سیدھا سادہ ہوتا ہے۔ جب حرف بن گئے۔ بڑی ہی خوشی ہوئی کہ بس اب کیا تھا کام مار لیا۔ اسی طرح ہر روز گھڑوں کے ڈھکنے لے جاتی جب لکھ چکتی۔ اُس کے ٹکڑے کر کے پھینک دیتی۔ جب گھڑے کھلے دیکھتیں تو کہتیں ایسا کون کمبخت ہے جو روز گھڑے کے ڈھکنے لے جاتا ہے؟ الٰہی اُس کے ہاتھ ٹوٹ جائیں۔

میں اس بُرے کام کو کر کے نہایت نادم اور شرمندہ ہوتی اور ڈرتی کہ ایسا نہ ہو کبھی کسی کو معلوم ہو جائے تو خفا ہوں دنیا کے بندوں کا ڈر رہتا۔ اور اس قدر تمیز نہ تھی کہ اپنی بدجرأت کو گناہ سمجھ کر خدا سے ڈرتی اس شوق نے مجھے ایسا اندھا کر دیا تھا کہ اپنی نالائق حرکت سے باز نہ آتی تھی اور جہاں تک ہو سکا خوب دفتر کالے کیے، مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا لکھ رہی ہوں مجھ کو اس قدر سمجھ نہیں تھی کہ پڑھنا بغیر کسی کے پڑھائے نہیں آتا میں جانتی تھی کہ جس طرح اور کام دیکھنے یا نقل کرنے سے آجاتے ہیں یہ بھی آجائے گا اس خیال سے بہت مدت سر کھپایا مگر کچھ حاصل نہ ہوا تو پھر وہی رونا شروع کر دیا۔ خدا نے ایک استاد دے دیا

خدا نے استاد دے دیا

ایک روز صبح کے وقت میں قرآن شریف پڑھ رہی تھی۔ میری دادی صاحبہ کی بہن کا لڑکا آیا اور مجھ کو پڑھتے دیکھ کر کہا۔ باجی تم کو قرآن شریف آتا ہے؟ میں نے کہا۔ ہاں۔ اس نے کہا۔ اگر سبق یاد کروا دیا کرو تو تمہارا بڑا ہی احسان ہو۔ مجھ کو سبق یاد نہیں ہوتا۔ اس پر اُستاد بہت مارتا ہے۔ میں نے کہا احسان کی کون سی بات ہے؟ میں تم کو ہر روز پڑھا دیا کروں گی۔ وہ خوش ہو گیا اور اپنی کمر کھول دکھائی۔ بیتوں کی مار سے زخمی ہو رہی تھی۔ مجھ کو اس پر بہت ترس آیا اور اس روز سے پیچھا بھی سُنتی اور آگے کو سبق دیتی۔ اُس روز سے اس کی مار موقوف ہو گئی۔

یہاں سے میری قسمت یاور ہوئی اور خدا نے میرے حال زار پر رحم کیا۔ وُہ یوں کہ ایک روز اُس کے بستے میں سے ایک کتاب گر گئی۔ میں نے اُس کو اُٹھا کر دیکھا تو اُس میں زیر زبر نہیں تھے۔ میں نے کہا یہ کیسی کتاب ہے؟ اس کے حرف ایسے ہیں جیسے مرثیہ کے۔ مجھ کو پڑھ کر سُنا۔ اُس نے جو سنائی تو مجھ کو اُس کی عبارت اچھی معلوم ہُوئی اور مجھ میں جان آگئی۔ میں نے کہا۔ اگر مُجھ کو اس کا سبق دے دیا کرو۔ تو میں تمہارا یہ احسان تا زندگی نہیں بھولوں گی۔ اُس نے صاف انکار کیا کہ اوّل تو مجھ کو فرصت نہیں اور دوسرے یہ کتاب بہت مشکل ہے۔ تم کو کبھی نہیں آنے کی۔ میں نے کہا تم پڑھانے کی حامی بھرو۔ میں محنت کر کے یاد کر لوں گی۔ اُس نے کہا میں یہ ذمہ نہیں کر سکتا مجھ سے نہیں پڑھائی جائے گی۔

اُس کے انکار سے مجھ کو نہایت رنج ہُوا اور میں نے کہا۔ اگر تم مجھ کو یہ کتاب نہیں پڑھاؤ گے تو میں بھی تم کو نہیں پڑھاؤں گی۔ یہ کہہ کر میں رونے لگی۔ جب اُس نے میرا انکار سُنا تو اپنی ماریاد آئی اور کہا اچھا تم خفا نہ ہو پڑھو۔ اس کے کہنے سے مجھ میں جان آگئی اور جھٹ آنسو پونچھ کر اُسی وقت بسم اللہ کر کے پڑھنا شروع کر دیا۔ ابھی میں نے پُورے تین ورق بھی نہیں پڑھے تھے جو اُس کے ابّا نے اُس کو دہلی پڑھنے بھیج دیا۔ مجھ کو اس کے جانے کا نہایت صدمہ ہُوا۔ بچّہ کیا پڑھاتا تھا؟ نہ ہجے کرائے۔ نہ کچھ سمجھایا۔ لیکن مجھ کو اتنا ہی غنیمت تھا۔ پھر وہی بیقراری شروع ہو گئی اور ایک ایک کی منّتیں کیں۔

جب کسی نے نہ پڑھایا تو آپ ہی اس کتاب کو پڑھنا شروع کر دیا اور

آگے کو دیکھتی جو حرف پڑھا ہوا نکلتا۔ اُس کو جوڑ کر بہت خوش ہوتی اسی طرح جوڑ کرتی اور کچّا پکّا نکالتی اور سبق کی طرح یاد کرتی غرض رفتہ رفتہ ساری کتاب ختم کی۔ پھر اسی طرح اور کتابوں کا مطالعہ کرتے کرتے خاصی اُنکل ہو گئی اور بخوبی اُردو پڑھنے لگی اور پھر وہ اپنے لکھے ہوئے مجرے سلام جن کو میں بالکل نہیں سمجھتی تھی، سب پڑھ لیے۔ اُس دن کی خوشی کیا بیان کروں جو مجھ کو ہوئی۔ یقین نہیں کہ پھر مجھ کو کوئی ایسی خوشی ہوئی ہو۔ اپنے لکھے ہوئے کو پڑھ کر زبان حوصلہ اور جُرأت ہو گئی اور سوچا کہ انسان کو جو کچھ حاصل ہوتا ہے۔ اپنی محنت اور شوق سے ہوتا ہے۔ اگر اچھا نہیں بُرا ہی سہی۔ میرا جو مطلب تھا وہ تو مجھ کو خدا کی رحمت سے حاصل ہو گیا۔ پھر اُسی جھاڑو کی سینک اور توے کی سیاہی کو میں نے اپنا اُستاد تصوّر کر کے لکھنا شروع کر دیا۔ چند روز کے بعد زبانی لکھنے لگی مگر کسی پر میرا لکھنا ظاہر نہ ہوا۔

میرے ابّا جان گوالیار میں وکیل تھے۔ جب میری چچی صاحبہ مرحومہ نے قضا کی تو میرے ابّا جان نے چچا صاحب کو اپنے پاس بلا لیا۔ دو بھائی بہن ہم تھے اور دو لڑکے چچا صاحب کے تھے ہم بچّوں کے واسطے نہ میرے ابا جان نے دوسری شادی کی۔ نہ اپنے بھائی کو کرنے دی۔ کنبے میں سے بہت سی باتیں آئیں، لیکن میرے ابّا نے منظور نہ کیں اور یہی جواب دیا کہ دوسری شادی اولاد کے واسطے کرتے ہیں جب ہماری اولاد موجود ہے تو شادی کر کے ان معصوم بچّوں کے لیے دشمن کھڑا کرنا مناسب نہیں کیونکہ ہم پردیسی ہیں۔ خُدا معلوم بعد ہمارے کیا آفت آن برپا ہو۔

رفتہ رفتہ منشن بن گئی

جب چچا صاحب مرحوم گوالیار تشریف لے گئے تب میرا لکھنا ظاہر ہوگیا۔ کہاں تک چھپاتی۔ مجھ کو بڑا ڈر اُن کا ہی تھا کیونکہ عورتوں کا لکھنا اُن کو پسند نہیں تھا۔ پھر ظاہر ہوکر لکھنے لگی اور پھر نہ کسی نے اُس کی روک کی بلکہ میرا لکھنا اپنے اور غیروں کے ہاتھ میں ایک کھلونا آگیا جس عورت کو کہیں خط لکھوانے کی ضرورت ہوتی۔ وُہ مجھ سے لکھواتی اور میں بڑی خوشی سے غلط سلط لکھ کر جو جو وہ باتیں بتاتیں لکھ کر حوالے کرتی۔ اس لکھنے کی بدولت ہر ایک کے دل کا پوشیدہ راز مجھ پر ظاہر ہوتا رہا جو بات کسی کے کہنے کی نہیں ہوتی تھی۔ وہ میرے سامنے ایک ایک لفظ بیان کرتی تھیں اور ان کے جواب بھی آجاتے تھے لیکن جو وہ مجھ سے لکھواتی تھیں سو میں سے دس پانچ ہی میں سمجھتی تھی اور ایک القاب کے سوا مجھ کو دوسرے کی تمیز نہ تھی سب خورد وکلاں کے لیے ایک ہی القاب تھا۔

سب خطوں میں ایک ہی القاب :۔

ایک بی بی نے مجھ سے اپنے شوہر کو خط لکھوایا میں نے اُن کی بی بی کی طرف سے جو القاب لکھا یہ تھا

برخوردار نورِ چشم راحت جان قرۃ العین طول عمرہٗ

اور کئی خطوں میں یہی القاب لکھا تھا۔ آخر اُن کے شوہر نے بی بی کو لکھا کہ

تمہارے خطوں کا مطلب بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کیونکہ اُس تحریر میں صاف تمہاری گفتگو معلوم ہوتی ہے لیکن یہ تو بتاؤ کہ ان خطوں کا لکھنے والا عجیب تحریر کا منشی کہاں سے دستیاب ہوا کہ جس کو سوائے ایک القاب کے اپنی طرف سے کچھ نہیں آتا۔ اُن سے کہنا کہ مہربانی فرما کر یہ القاب تحریر نہ فرمایا کریں۔ پھر جو اُنہوں نے خط لکھوایا تو مجھ سے کہا کہ خط پر شروع میں صرف اتنا لکھا کرو کہ محمد حسین کے ابّا کو واضح ہو۔

دہلی کے غدر میں خطوں کا آنا جانا بند ہو گیا تھا اس سبب سے میرے ابّا جان کے پاس سے کوئی خط ڈیڑھ سال تک نہیں آیا تھا نہ ہمارے پاس سے گیا ہر دو جانب سے نہایت فکر رہتا تھا۔ جب کچھ امن کی صورت ہوئی، تو میرے ابّا جان نے ایک قاصد ہماری خبر کے واسطے بھیجا جب وہ گوالیار کو روانہ ہوا تو میری دادی صاحبہ مرحومہ نے اپنے بھائی سے خط لکھوا کر دیا اور ایک خط مَیں نے غدر کے تمام حالات کا جو جو میں نے آنکھوں سے دیکھا اور سُنا تھا سب لکھا اور اُس کے شروع میں بھی وُہی برخوردار نورِ چشم راحت جان والا القاب ابّا جان و چچا جان کو لکھا۔

میرے اس خط کو پڑھ کر وہ نہایت خوش ہوئے اور لکھا کہ جناب ماموں صاحب کے خط سے صرف گھر کے آدمیوں کی خیریت معلوم ہوئی اُنہوں نے اَور کسی عزیز کی خیریت سے مطلع نہیں کیا اور نہ کچھ غدر کے واقعات کا حال لکھا اور اس لڑکی کی تحریر سے نہایت خوشی ہوئی۔ کیونکہ اُس نے جو سُنا تھا اور دیکھا تھا سب تحریر کیا اس کے خط نے اخبار اور تاریخ کا مزہ دیا۔ ہر روز میں ایک دفعہ

اس کو پڑھتا ہوں۔ مگر یہ تو بتایئے۔ کہ اس کو کس نے لکھنا سکھایا؟

میری دادی صاحبہ نے لکھا کہ اس کو کسی نے آج تک ایک حرف بھی نہیں بتایا اس نے اپنے شوق سے محنت کر کے خود سیکھ لیا۔ پھر میں نے اپنے شوق سے لکھنے کی کل کیفیت لکھی تو انہوں نے اس انعام میں مجھ کو ایک دلائی بیش قیمت اور کئی جوڑے کپڑے سلا کر بھیجے مگر میرے چچا صاحب خدا ان کو غریق رحمت کرے۔ میرے لکھنے سے بہت ناراض ہوئے ایک اور خط مجھ کو ملامت کا لکھا اور تا زیست اُن کے دل سے یہ رنج نہ گیا۔

یہ کیفیت میرے لکھنے پڑھنے کی ہے جو میں نے تحریر کی اس محنت اور جانفشانی سے میں نے یہ ذرا ظہور حاصل کیا اور اس تھوڑے پر قناعت کر کے خُدا کا شکر کیا۔

ازدواج

بی اشرف کے دادا صاحب کے تین بھائی تھے۔ ان میں سے ایک میر نثار علی تھے۔ ان کے دو لڑکے ہوئے جن میں چھوٹے لڑکے علمدار حسین سے بی اشرف کی نسبت ایام صغیر سنی میں ہی ہو گئی۔ اس زمانے میں اُن کے خاندان میں یہ دستور تھا کہ لڑکی کے پیدا ہوتے ہی خاندان ہی کے لڑکے سے بات چیت ہو جایا کرتی تھی اور اُس کی پابندی بڑی احتیاط سے کی جاتی تھی اس رشتہ کے قائم رکھنے پر طرفین سے سخت اہتمام رہتے تھے۔ چنانچہ اسی

رواج کے مطابق یہ رشتہ قائم رہا اور علمدار حسین کے والدین کے انتقال کے بعد بھی کسی کو اس میں رخنہ اندازی کا حوصلہ نہ ہوا آخر بعد غدر ۱۸۵۹ء کے شروع میں بی اشرف کی شادی ہو گئی۔

ان کے شوہر علمدار حسین صاحب جو اپنی علمیت کی وجہ سے نوجوانی سے ہی مولوی علمدار حسین کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ بڑے صاحب علم اور عقیل و ذکی تھے۔ اُن کو اُن کے والد بزرگوار نے پُرانے عربی دہلی کالج میں پوری تعلیم دلوائی تھی۔ وہ اپنی جماعت میں ہمیشہ سب سے اوّل رہتے تھے۔ عادات و اخلاق کے لحاظ سے نہایت راست باز نیک اطوار اور پابند مذہب اور جوان صالح تھے۔ ذکی اس درجہ کے کہ اکثر ہم جماعت اپنے اپنے سبق کی مشکلات ان سے آکر حل کرواتے۔ شادی سے پہلے وہ کچھ عرصہ کے لیے پنجاب میں ضلع جالندھر کے ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہ چکے تھے مگر پھر وہ اسامی تخفیف میں آگئی تھی۔

مولوی علمدار حسین شادی کر کے وطن سے پنجاب میں آئے۔ اس زمانے میں میجر فلر صاحب بہادر ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم تھے۔ انہوں نے ضلع سکول لاہور میں تیس روپے کی مدرسی پیش کی۔ مولوی صاحب مرحوم نے صاحب موصوف سے کہا کہ اگر اس کمی تنخواہ کے ساتھ میری سابقہ عزت میں بھی کچھ کمی ہو گی تو مجھے منظور نہیں۔ جس پر صاحب بہادر نے اطمینان دلایا کہ گورنمنٹ کی نگاہوں میں ان کی عزت پہلے سے بھی زیادہ ہو گی اور بہت جلد ترقی بھی ہو جائے گی۔ چنانچہ ڈائریکٹر صاحب بہادر نے ان کو تھوڑے ہی دنوں میں گورنمنٹ کالج لاہور

میں عربی و فارسی کا اسسٹنٹ پروفیسر کر دیا اور انہوں نے اس عہدے کے فرائض نہایت قابلیت اور جانفشانی سے ادا کیے۔

میاں بیوی کا باہمی سلوک :-

بی اشرف جن کو اب زیادہ تر بوبو صاحبہ کے نام سے بلانے لگے تھے بڑی خوش قسمت تھیں کہ ان کا سنجوگ ایسے لائق اور نیک شخص سے ہوا۔ میاں بیوی میں باہم بہت محبت و اخلاص تھا اور وہ اخیر دم تک قائم رہا چونکہ دونوں دیندار خدا ترس پابند شریعت تھے اس لیے کبھی باہمی رنجش اور کدورت کا موقع پیدا نہیں ہوا۔ گھر کا کل انتظام بیوی کے ہاتھ میں تھا جس کو وہ نہایت خوبی اور سلیقہ سے انجام دیتی رہیں اور میاں کے میلان فیاضی کو ہمیشہ اپنی ذاتی نیکی اور نیک نیتی سے مدد پہنچاتی رہیں۔ مستورات کے مزاج میں عموماً سخت نہیں تو کفایت شعاری کا خیال تو ضرور ہوتا ہے اور فیاض بھی کچھ ہوئیں تو اُن کی فیاضی کا پلّہ تمام تر اپنے میکے کی طرف ہی جھکا رہتا ہے بخلاف اس کے بی اشرف کے سلوک اور احسان بیگانوں اور بیگانوں سب کے ساتھ یکساں تھے۔

بی اشرف نے سلائی کا ضروری کام وطن میں اپنے خاندان کی بیبیوں سے سیکھا تھا۔ شادی کے بعد لاہور میں اگر دہلی کی ایک نیک بی بی سے جو ان کے مکان کے قریب رہتی تھیں۔ جالی کا کام بھی سیکھ لیا اور اس ہنر میں اچھی مشق حاصل کر لی تھی۔

اولاد

بوبو صاحبہ کے ہاں اولاد ایک لڑکا اور تین لڑکیاں ہوئیں جن میں سے لڑکا جس کا نام عباس حسین رکھا گیا تھا۔ برس سوا برس کی عمر میں فوت ہوگیا۔ ایک لڑکی اصغری بیگم نے بھی شیر خوارگی میں ہی انتقال کیا۔ دو لڑکیاں جعفری بیگم اور احمدی بیگم باپ کے ایام حیات کے بعد تک زندہ رہیں اور جوان ہوئیں۔

لڑکیوں کی تعلیم و تربیت مولوی صاحب کی حیات میں بوبو صاحبہ خود کرتی رہیں اس کے بعد بعض عزیزوں کے اصرار سے انہیں زنانہ اسکول میں داخل کر دیا۔ جہاں لڑکیوں نے اپنی محنت اور ذہانت اور خاندانی شرافت کی خوبیوں کی وجہ سے حکام مدرسہ اور استانیوں کے دل میں جگہ کر لی۔ پڑھنے لکھنے، سینے پرونے اور اور ہنروں میں سب لڑکیوں سے بڑھ گئیں۔ سالانہ جلسوں میں اپنی دستکاریوں اور عمدہ عمدہ کاموں کے انعام پاتی رہیں۔ ذہن اور طبیعت ایسی خداداد پائی تھی کہ کوئی کام ایک دفعہ نظر سے گزرا اور اُن کے دل نشین ہوگیا۔ محنت اور شوق کا یہ حال تھا کہ مدرسہ سے گھر پہنچیں۔ کھانے پینے سے فراغت پائی اور فوراً کام پر بیٹھ گئیں۔ لڑکیوں کی طرح کھیلنا کودنا جانتی ہی نہ تھیں یہی سبب تھا کہ تھوڑی سی عمر میں بہت کچھ حاصل کر لیا۔ یہ سب کچھ اپنی والدہ کی ابتدائی تعلیم و تربیت کا فیض اور صحبت کا نتیجہ تھا۔ شرم و حیا ادب اور سلیقہ۔ دینداری اور راستبازی۔ پیر چشمی۔ خوش اطواری غرض سب نیک صفتوں میں دونوں لڑکیاں اپنی ماں کی نظیر تھیں۔

۱۸۷۰ء میں مولوی علمدار حسین صاحب نے مرض دق سے ۳۹ برس کی عمر میں بہ مقام لاہور انتقال فرمایا اور گامے شاہ کے مقبرے میں مدفون ہوئے ان کے انتقال پر عام طور پر رنج ہوا۔ ڈائریکٹر بہادر سررشتۂ تعلیم پنجاب نے اپنی سالانہ رپورٹ میں اس واقعہ پر اظہار افسوس میں یوں تحریر فرمایا کہ مولوی علمدار حسین کی وفات نے عام تعلیم کو سخت نقصان پہنچایا۔ مولوی صاحب کا عمائدین و رؤسائے شہر میں بڑا رسوخ اور اقتدار تھا جو ترویج تعلیم کے بارہ میں بہت ضروری اور مفید ہے۔

شوہر کے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے دادی کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ شوہر کے مرنے سے یک لخت بیوگی کا ایک عظیم الشان پہاڑ سر پر آن پڑا۔

جب اس واقعہ کی خبر گوالیار پہنچی۔ بو بو کے والد بے تاب ہو کر وہاں سے چلے کہ اپنی لختِ جگر کی اس مصیبت میں دلداری اور سرپرستی کریں۔ چنانچہ وہ مولوی صاحب مرحوم کی تعزیت چہلم میں شریک تھے۔ مگر بو بو کی قسمت میں راحت نہ تھی چند روز کے بعد ۱۸۷۱ء میں پیارے باپ کا سایۂ شفقت بھی سر سے اُٹھ گیا۔ اور اس تازہ مصیبت نے مرحومہ کے دُکھے دل کو اور بھی سخت صدمہ پہنچایا۔ مگر خدا اُن کو اُن کے صبر کی جزائے خیر دے کہ انہوں نے اس مصیبت کو بھی بڑے استقلال سے سر پر اُٹھایا۔

مولوی صاحب مرحوم دائم المرض تھے۔ اس کے سوا اپنے عزیز و اقربا کی تعلیم کے دلدادہ تھے۔ ہمیشہ ان کے پاس کُنبے کے چار چار پانچ پانچ بچے رہتے تھے اور اُن کی پرورش اور تعلیم کا سارا خرچ آپ اُٹھاتے تھے۔ ظاہر ہے

کہ ایسا شخص اپنے عیال کے لیے کیا پس انداز کر سکتا ہے۔ مرحوم نے عیال کے لیے کسی قدر زیور۔ کچھ ظروف مِسی، کچھ کتابیں۔ آٹھ سو روپے نقد اور ایک نہایت قلیل آمدنی کی جائداد وطن میں چھوڑی۔ زیور اور ظروف میں سے بہت کچھ بڑی لڑکی کی شادی میں دیا گیا۔ مولوی صاحب مرحوم کے بعد اول دفعہ جو وطن جانا ہُوا۔ آٹھ سو روپے نقد وہاں رائیگاں تلف ہو گئے۔ کتابیں انبالہ کے مدرستہ المومنین میں برادران ایمانی کی فائدہ رسانی کے لیے وقف کر دی گئیں اور بی اشرف کو اس بیوگی کی حالت میں عالم غربت اور بےکسی میں ہاتھ کے ہُنر کے سوا اَور کوئی سہارا یا ذریعۂ معاش نہ رہا۔ مگر انھوں نے بڑے صبر اور استقلال سے اس صدمہ کو برداشت کیا اور اپنے ہاتھ کے ہُنر سے اپنے اخراجات میں کسی قسم کی کمی نہیں آنے دی اور بڑی آبرو اور عزت سے بسر کی۔ مولوی صاحب مرحوم کے زمانے میں جتنے بچّے تھے وہ بھی سب پاس رہے اور کھانے پینے کے سوا اور طرح طرح کی خدمت اور سلوک اُن کے ساتھ کرتی رہیں۔ خود اپنی ذات کے سوا اور چھ آدمیوں کا خرچ تھا جو بڑی سیر چشمی، خوش اسلوبی اور انتظام سے جاری رہا۔

ان ایّامِ مصیبت میں مولوی صاحب مرحوم کے اکثر احباب نے ازراہِ دل سوزی یہ چاہا کہ بی اشرف کسی طرح زنانہ مدرسہ میں مدرّسہ ہو جائیں یا سرکار کی طرف سے بنظرِ حسنِ خدمات مولوی صاحب مرحوم کچھ وجہِ معاش ان کے یتیموں اور بیوہ کے لیے مقرر ہو جائے۔ چنانچہ انھوں نے دَرپردہ حُکّام سررشتۂ تعلیم سے مل کر اس امر کی درخواست کی۔ چونکہ ملازم کے

پس ماندوں کی اس قسم کی امداد کے لیے کوئی قاعدہ نہ تھا اس لیے اس طرف سے مایوسی ہوئی۔ مگر چونکہ ڈائریکٹر صاحب بہادر مولوی صاحب کی خدمات کو نہایت قدر و وقعت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے مرحومہ کو ایک چٹھی اپنے ہاتھ سے مولوی صاحب کی تعزیت میں نہایت دلسوزی اور ہمدردی سے لکھی اور یہ بھی تحریر فرمایا کہ اگر آپ زنانہ سکول لاہور کی معلمی منظور کریں تو ہم نہایت خوشی سے وہ اسامی دے سکتے ہیں اور مولوی صاحب کی دو لڑکیاں مدرسہ میں داخل کر دیجیے اُن کے پانچ پانچ روپے وظیفے ہم نے مقرر کر دیے ہیں۔ اس پر بی اشرف نے نہایت مشکوری کے ساتھ لڑکیوں کا وظیفہ منظور کر لیا۔ مگر اپنی ملازمت کے بارے میں انکار لکھ بھیجا۔

بی اشرف کی قسمت میں آرام کی زندگی نہ لکھی تھی بچپن کا زمانہ جو ماں کی عاطفت میں بسر ہوتا ہے وہ اُن کی موت سے بالکل تلخی میں گزرا۔ وہ زمانہ طرح طرح کے صدمے اُٹھا کر ختم کیا تھا اور خوش قسمتی سے اچھا شوہر نصیب ہوا تھا کہ بدقسمتی سے وہ بھی راس نہ آیا اور تھوڑے عرصے میں ہی بیوگی کی مصیبتوں نے آلیا۔ شوہر کے گزر جانے پر کچھ رہی سہی دلجوئی باپ کے دم سے تھی۔ مگر بیٹی کے اُن صدمات نے باپ کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ اب دنیا میں اگر کوئی ذریعہ بہت خوشی یا اُمید کا تھا تو وہ اُن دو بچوں کا تھا جن کو پڑھتے اور علم عزیز کی تعلیم حاصل کرتے دیکھ کر اُن کا مرجھایا ہوا دل خوش ہوتا تھا۔ مگر آہ ابھی ان کی مصیبتوں کا خاتمہ نہیں ہوا تھا اور ابھی صدمے پر صدمے آنے تھے۔ چنانچہ اُن دونوں لڑکیوں میں سے بھی گویا دونوں آنکھوں

کا نور اور دِل کا سرور تھیں۔ احمدی بیگم نے عین شباب میں تپ کہنہ کی تکلیفیں اُٹھا کر اپنی بیوہ ماں کو داغ مفارقت دیا اور تھوڑے عرصہ بعد جعفری بیگم نے بھی جس کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ ایک شیر خوار لڑکا وہاج الحسن نامی چھوڑ کر اپنی بے وقت موت سے اپنی مصیبت زدہ ماں کی مصیبتوں کو دوبالا کیا اور اُن کو اپنے فراق میں نیم بسمل چھوڑ گئیں۔ شیر خوار وہاج الحسن بھی جو اپنی موئی ہوئی ماں کی نشانی تھا۔ دو برس کا ہو کر اپنی غمزدہ نانی کو چھوڑ کر اپنی اماں کے پاس جا پہنچا۔

غمزدہ بی اشرف پر اس وقت جو کچھ گزرا اُس کا اندازہ ہر صاحب اولاد بی بی خود کر سکتی ہے۔ اب دُنیا میں ایک بھائی کی صورت کے سوا اور کوئی صورت ایسی نہ رہی جس سے اُن کو کوئی ذاتی تعلق ہوتا۔ گھر بالکل اجاڑ اور بے چراغ ہو گیا۔ کوئی سہارا نہ رہا جو اس رنج و غم کی حالت میں خاطر حزیں کے لیے موجب تسکین ہوتا زندگی نہایت تلخ اور ناگوار ہو گئی۔

حقیقت میں بوبو صاحب کی بیٹیاں ایسی صاحب کمال اور ہر صفت سے موصوف تھیں کہ ہر دیکھنے والی بی بی کا دل اُنھیں دیکھ کر باغ باغ ہوتا تھا۔ ایسی لائق بیٹیوں کے فراق میں کیا کچھ رنج و غم نہ کیا جاتا۔ خاکسار مؤلفہ کو جعفری بیگم کی بعض تحریروں کے دیکھنے اور پڑھنے کا اتفاق ہُوا ہے حقیقت میں وہ تحریریں بلحاظ کتابت اور مضمون دونوں طرح نہایت پاکیزہ ہیں۔ جو لڑکیاں اُن کے ساتھ ہم جماعت رہ چکی ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنی اُن سہیلیوں کو نہیں بھولیں گی۔ مجھے بوبو صاحبہ کے کاغذات میں سے ایک تحریر ملی ہے جس کا عنوان اشتیاق نامہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب جعفری بیگم نے مدرسہ

چھوڑا تو انہوں نے اپنی سہیلیوں اور ہمجولیوں کی یاد میں یہ نظم لکھی ہم اس نظم کو بعینہٖ یہاں درج کرتے ہیں۔

اشتیاق نامہ

جس وقت کہ میں مدرسے میں جاتی تھی پڑھنے
آتی تھیں میرے پاس وُہ ہمجولیاں یہنیں
سیکھے تھی کوئی کام۔ کوئی پڑھتی تھی آ کر
نقشہ کوئی لے بیٹھتی تھی آ کے برابر
کاپی کوئی لاتی تھی۔ کہ دِنی بیل بنا دو
مجھ کو نہیں آتی ہے۔ ذرا تم ہی بنا دو
چُھٹی کبھی لیتی تھی۔ تو یہ کہتی تھیں آکر
بالکل نہ لگا دل ہمارا کل تو یہاں پر
آ آ کے یہ کہتی تھیں کہ کیا کرتی ہو بیوی
سنسان مدرسے کو کیے جاتی ہو بیوی
کِس طرح لگے گا یہاں دل آہ ہمارا!
ویران مدرسے کو کرو اب نہ خدارا!
یہ مجھ کو تعجب ہے۔ کہ اب کیوں کہ لگا دل
اب کوئی نہیں آن کے کہتی ہے یہ مِل مِل

خالی ہے مدرسہ یہ ویران جگہ ہے
ہمجولیوں کا دل تم ہی میں اب تو لگا ہے
رہتی ہیں لگی در کو مری آنکھیں برابر
کہتی ہوں کہ اب آئے گی کوئی میری خواہر
دل چاہتا ہے بھانجے کو اپنے میں دیکھوں
چھاتی سے لگا پیار کروں۔ گودی اُسے لیلوں
گودی میں سلاؤں اسے دے دے کے یہ لوری
نیند آئے سُلا جائے بڑی عُمر ہو تیری
ہو علم مقدّر میں ترے اے مرے پیارے
مقصد ترا بر آئے۔ جہاں پر تو سدھارے
ہو رُعب ترا سب پہ۔ یہ ہوں مرتبے تیرے
دشمن نہ ہو تیرا کوئی سب دوست ہوں تیرے

جعفری بیگم کے ہاتھ کا ایک خط بھی ہمیں مِلا ہے افسوس اُس کا ابتدائی حصّہ تلف ہو چکا ہے جس قدر باقی ہے اُسے ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ وُہ خط یہ ہے۔

ہمشیرہ من! جس وقت میں نے عبدالمجید کے انتقال کا واقعہ سُنا۔ پہلے تو بمقتضائے بشریت میرے دل کو ایک دھکا سا لگا لیکن پھر دل کو صبر و قرار دیکر سمجھایا۔ کہ کُلُّ نَفْسٍ ذائقۃُ الموتِ : بقول شاعر:۔

فی المثل کارروان سرا ہے یہ واقعی منزل فنا ہے یہ
خواہ بندہ ہو خواہ ہو آزاد موت کی رسہ پڑنا ہے افتاد
کوئی محبوب۔ کوئی دلبر ہو۔ وقت جب آن کر برابر ہو
گر کرو بند بُرج آہن میں رکھو کیسے ہی اُس کو مامن میں
مرگ جا کر وہیں گزار کرے ہو کہ شبر اس کا وہ شکار کرے
بس نہیں کچھ کِسی کا چلتا ہے یاں ہر اک شخص ہاتھ ملتا ہے

اس ضرب تیغ اجل سے۔ کہ مرہم پزیرد لایق تدبیر نہیں کسی بشر کو نجات نہیں۔ بقول شاعر ؎

دیکھیئے گر بچشم ہشیاری عالم خواب ہے یہ بیداری
کرلے جو کچھ کرے کہ فرصت ہے زندگی چار دن غنیمت ہے
ورنہ پھر جس گھڑی مُندے یہ پلک خواب کنج لحد ہے حشر تلک

ایک موسم ایسا ہوتا ہے کہ درخت اور بُوٹے کیسے سرسبز اور تر و تازہ و پُر میوہ نظر آتے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر آدمی کا دل باغ باغ ہوتا ہے۔ پھر ایک موسم ایسا آتا ہے۔ کہ وہی درخت مرجھائے اور اُداس صورت بنائے جاتے ہیں۔ جنھیں دیکھ کر انسان کا غنچۂ دل کملایا جاتا ہے۔ ہمشیرۂ من اگر انسان کو کوئی خوشی ہو تو رنج کا ہونا مقدّم جانیے۔ بقول شخصے کہ

"ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے"

ہمشیرۂ من آپ کو چاہیئے کہ ہر وقت اپنے دل کو سمجھاتی رہو اور صبر و قرار کو ہرگز ہاتھ سے نہ دو۔

راقمہ جعفری

ان لائق اور ہونہار لڑکیوں کی موت جس سے نہ صرف ان کے عزیزوں کو رنج تھا بلکہ تمام مدرسے کو۔ واقعی ایسا حادثہ تھا کہ اُن کی والدہ جتنا رنج کرتیں وہ تھوڑا تھا۔ چنانچہ عرصۂ دراز تک وہ اُن جواں مرگ بیٹیوں کو روتی رہیں۔ اُن کے کاغذات میں سے ہمیں چند شعر ملے ہیں جو انہوں نے اِنھیں دِنوں میں فرطِ غم میں بطور مرثیے کے لکھے۔ ہم وہ اشعار بعینہ یہاں درج کرتے ہیں۔ ؎

اے دوستو میں عالمِ غربت میں لُٹ گئی   بستی مری لاہور کے جنگل میں جا بسی
دن رات جیسی مجھ پہ گزرتی ہے کیا کہوں   گر موت آئے مجھ کو میں شکر خدا کروں
گھر میرا اس طرح تھا عزیزو ہرا بھرا   جیسے کہ کوئی باغ ہو پھولا پھلا ہوا
افسوس اس میں ایسی یہ بادِ خزاں چلی   گُل ہی رہا چمن میں نہ باقی رہی کلی
دو بیٹیاں تھیں بیبیو مجھ بدنصیب کی   اُن کی خوشی میں کاٹتی تھی میں یہ زندگی
آنکھیں تھیں دونوں میری ہی نورِ چشم تھیں   افسوس مجھ کو چھوڑ کے تنہا وہ چل بسیں
میں تین سال روتی ہوں تم کو اے حمدی   اب عمر بھر میں روؤں گی تم کو اے جعفری
سمجھاؤں کس طرح دلِ خانہ خراب کو   بھولوں میں کس طرح تمہیں پیاری جواب دو
زیور کسے پہناؤں گی بیٹی جواب دو   دولھن کسے بناؤں گی پیاری جواب دو
تو کچھ تو مجھ کو اے مری پیاری جواب دے   کپڑے کسے پہناؤں میں تیرے جہیز کے
حسرت سے میرے دل میں کچھ کھا ہی گئیں   محنت کا اپنے کھا گئیں اور جاں بحق ہوئیں
دونوں سے ہاتھ جوڑ کے میں نے تھا یہ کہا   جاتی ہو واں نہ آؤ گی جس جا سے مطلقاً
پر لِلّٰہ مجھ پہ اتنا تو احسان کیجیو   ہر روز خواب میں مجھے دیدار دیجیو

ہر شب خدا سے مانگ کے سوتی ہوں یہ دعا — اللہ میری پیاریوں کو خواب میں دکھا
یارب نہ کر کسی کو تو مجھ بد نصیب سا — اولاد سے کسی کو بھی کرنا نہ تو جدا
کر صبر اب تو بہر خدا اشرف النسا — صابر کا رتبہ عاقبت میں ہے بہت بڑا
گر رنج تجھ کو کرنا ہے۔ آلِ نبیؐ کا کر — اور یادِ حق میں اپنی یہ سب عمر کر بسر

ان کی شاگرد عمدہ بیگم صاحبہ کا بیان ہے کہ جن دنوں میں اسکول داخل ہوئی تو اُستانی صاحبہ کی دونوں لڑکیاں مر چکی تھیں۔ اُستانی صاحبہ کے دل پر اُن کا نہایت قلق تھا اور وُہ اپنی لڑکیوں کے واسطے اس قدر رویا کرتی تھیں کہ ایک رومال تہ کر کے اس طرح پر چہرے پر رکھتی تھیں کہ آنکھیں کھلی رہتی تھیں اور باقی نیچے کا چہرہ اس رومال سے ڈھکا رہتا تھا۔ لڑکیوں کو پڑھاتی جاتی تھیں اور آنکھوں سے آنسو برابر جاری رہتے تھے۔ یہاں تک کہ تمام رومال تر ہو جاتا تھا تب اُس رومال کو چہرے پر سے اُٹھا کر نچوڑتی تھیں اور پھر تہ کر کے اُسی طرح چہرے پر رکھ لیتی تھیں غرض ایک دم کو آنکھ کا آنسو نہ تھمتا تھا۔ آخر کار اپنے دل کے بہلانے کو مسئلے مسائل کی کتابیں پڑھیں جن میں یہ لکھا پایا کہ اولاد کے واسطے ماں باپ کو رونا گناہ ہے۔ انسان کو سوائے آلِ نبیؐ کے غم کے اَور کسی پر غم نہیں کرنا چاہیے چنانچہ پھر رفتہ رفتہ اپنا تمام دھیان آلِ نبیؐ کی طرف لگا لیا اور ہمیشہ مجلسیں کرتیں اور مرتے دم تک انھیں کی مصیبت پر روتی رہیں۔

یہ رنج و غم مقتضائے بشریت سے تھے اور بے اختیاری کی بات تھی لیکن ان کے بعد کی زندگی نے یہ بات بخوبی ثابت کر دی کہ وہ مشیت ایزدی

پر نہایت صابر اور ہر وقت شکر گزار تھیں۔ گویا یہ مصیبتیں ابتلا اور امتحان تھے جن سے وہ اپنی آئندہ زندگی کے لیے روحانی تربیت پاتی تھیں۔

صبر جمیل

دنیا میں کون ایسا شخص ہے جس پر مصیبتیں نہ پڑی ہوں اور رو پیٹ کر اُس پر خاموش نہ ہو رہا ہو مگر اس کو صبر ممدوح نہیں کہہ سکتے۔ مصیبت۔ دُکھ درد۔ رنج و غم۔ ایذا و تکلیف وغیرہ باتوں کو امور ناگزیر سمجھنا اور زبان کو شکوہ و شکایت سے آشنا نہ کرنا بلکہ دُنیا میں اپنے ابنائے جنس کی سخت مصائب سے اپنی تکالیف کا مقابلہ کرنا اور بزرگانِ دین کی مصیبتوں کو یاد کر کے اپنے دل کو سمجھانا اور ہر حال میں خدا کا شکر بجا لانا رنج و راحت میں خدا کی مشیت پر راضی اور خوش رہنا، محض اپنے خدا پر اپنی تمام اُمیدوں کا چھوڑنا اور اُسی کی پاک ذات سے ہر طرح کا آسرا رکھنا، غیروں کے مصائب میں اپنی تکلیفیں بھول جانا اور اُن کے دُکھ درد میں شریک ہونا صبر جمیل کہلاتا ہے۔ ان باتوں میں بوبو صاحبہ اپنی بہنوں کے لیے اُس زمانہ میں ایک بے نظیر اور قابل تقلید نمونہ تھیں۔ چنانچہ انہوں نے تھوڑے عرصہ کے بعد اپنی تمام مصیبتوں پر صبر کر کے ماؤں کی سی خوشی کے ساتھ اپنے داماد کی دوسری شادی بڑے اہتمام سے کی اور اپنی لڑکی کا سارا زیور اور دان و جہیز داماد کی دوسری بیوی کو چڑھا دیا۔ اور اس دوسری بیوی کے ساتھ اپنی تمام عمر ہنسی خوشی سے گزار دی اور اس کی اولاد سے وہی محبت برتی

جیسی اپنی اصل اولاد سے برتتے ہیں۔ انھیں پالا پوسا۔ اور ان پر ہمیشہ ماں کی طرح فدا رہیں۔

ملازمتِ سرکاری

ہر چند بی اشرف نے پرلے درجے کا صبر و استقلال دکھایا اور اپنے ہاتھ کی محنت اور مزدوری بھی جس جاں فشانی سے ہو سکتی تھی اُس میں کچھ کوتاہی نہ کی۔ پھر بھی اس ذریعہ سے جو مختصر آمدنی حاصل ہوتی تھی وہ اخراجات ضروری کے لیے کافی نہ تھی۔ وہ فرطِ غم میں اور اپنی خاندانی آن کے خیال سے صاحب بہادر ڈائریکٹر کی درخواست معلّمی کو نامنظور کر چکی تھیں مگر اب جناب حاجی مولوی خواجہ ابراہیم حسین صاحب پانی پتی کے سمجھانے بجھانے پر راضی ہو گئیں اور ۱۸۷۸ء میں حاجی صاحب موصوف کی سعی بلیغ سے صاحب بہادر ممدوح نے دوبارہ بی اشرف النساء کو اُس اسامی کے قبول کرنے کے لیے لکھا اور انہوں نے بالاغرض یہ آسامی منظور کر لی پہلے کچھ عرصہ تک پندرہ روپیہ ماہوار ملتے رہے پھر عرصہ بعد بیس روپے ہو گئے اور پھر ترقی پا کر پچیس ہو گئے۔

وکٹوریا گرل اسکول

یہ مدرسہ جس میں انہوں نے ملازمت اختیار کی۔ لاہور کا ایک نیم سرکاری مدرسہ ہے جو رؤسائے شہر لاہور و والیان ریاست ہائے پنجاب اور سرکار کی مدد سے چلتا ہے اگرچہ وہ اب پنجاب میں سب سے اوّل درجہ کا مدرسہ

ہے لیکن اُس زمانے میں جب بی اشرف اُس میں معلّمہ مقرر ہوئیں اُس کی کچھ حیثیت و وقعت یا شہرت نہ تھی۔ بلکہ بعض ارکان مدرسہ کی بے پروائی اور بے اعتدالیوں سے وہ بدنام ہوگیا تھا اور شرفا اپنی بہو بیٹیوں کو وہاں بھیجنے سے کانوں پہ ہاتھ رکھنے لگے تھے۔ اُن کے آتے ہی مدرسہ کی کایا پلٹ گئی۔ اور جو لوگ مدرسے سے نفرت کرتے تھے۔ وہی بڑے شوق سے اپنی لڑکیوں کو مدرسے میں بھیجنے لگے۔ اب تک اُس مدرسے میں بہت چھوٹی عمر کی لڑکیاں پڑھتی تھیں اور ان کو گھر پہنچانے اور لانے کے واسطے ایک ڈولی رہتی تھی۔ جب لڑکیوں کی تعداد بڑھنے لگی تو وہ ایک ڈولی کافی نہ رہی۔ استانی صاحبہ کی محنت اور کشش نے شرفا کی بہو بیٹیوں کو اس قدر شوق سے کھینچ بلایا کہ ڈولیوں کی تعداد بڑھتے بڑھتے سات تک پہنچ گئی۔

بی اشرف کو جنھیں میں آیندہ استانی کہوں گی مدرسہ کی نیک نامی اور عزت کا بڑا خیال رہتا تھا۔ یہاں تک کہ سب سے پہلے مدرسہ میں چلی جاتی تھیں اور جب تک مدرسہ کی ایک ایک لڑکی گھر نہ پہنچ جاتی تھی۔ خود گھر نہ آتی تھیں جس سے اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ایک ایک دو دو بجے گھر پہنچتی تھیں اس خیال سے کہ مدرسہ میں تعلیم کی ترقی ہو۔ اپنے بھائی سے بڑی کد و کوشش کے ساتھ فارسی عربی پڑھنی شروع کی اور تھوڑے ہی عرصہ میں خاصی استعداد پیدا کرلی یہاں تک کہ جب مدرسہ کی پڑھائی کا نصاب بڑھا اور امتحان مڈل کی معیار تک پہنچ گیا اور امتحان ہونے لگا تو پڑھانے کے لیے کسی نئی معلّمہ کی ضرورت محسوس

نہ ہونے دی اور بڑی خوبی سے اس بارگراں کو سر پر اٹھا لیا۔ امتحان میں ان کے مضمون میں ساری لڑکیاں اچھے درجہ پر پاس ہوتی رہیں اور آج تک کوئی فیل نہیں ہوئی۔

حکام کے دل میں اُن کی نہایت عزت اور وقعت تھی۔ مدرسہ کی جو میم یا مس سپرنٹنڈنٹ اور منتظم ہوئیں، وہ ہمیشہ ان کی صلاح و مشورہ پر چلتی رہیں۔ سال میں ایک دو دفعہ ضرور ان کے مکان پر آتی تھیں اور گھنٹوں اُن کی صحبت سے محظوظ اور مسرور ہوتی تھیں۔ لندن اور امریکہ کی نووارد ذی عزت بیبیاں جو لاہور میں آتی تھیں اُن کو خاص طور پر ملاقات کے لیے ان کے مکان پر آنا ضرور تھا۔ سالانہ انعامی جلسوں میں پنجاب کے حکام اور نواب لفٹنٹ گورنر بہادر وقت کی لیڈیوں سے خصوصیت کے ساتھ ان کا ذکر اور تقریب ہوتی تھی۔ مس فرانسس صاحبہ انسپکٹر مدارس زنانہ کے دل میں ان کی اس قدر عزت تھی کہ انہوں نے مس بوس صاحبہ سپرنٹنڈنٹ حال وکٹوریا گرل سکول لاہور سے کئی دفعہ زبانی فرمایا کہ بڑی اُستانی اگر بوجہ ضعیفی کام کے لائق بھی نہ رہیں تو میں تب بھی اُن کو مدرسہ میں رکھوں گی۔ مجھے ان کا مدرسہ میں صرف بیٹھے رہنا ہی غنیمت معلوم ہوتا ہے۔

مدرسہ کے پردہ میں جس کی استانی صاحبہ بڑی دل دادہ تھیں۔ بہت اصلاح ہوئی۔ پہلے مسلمان لڑکیاں ہندو مدرس سے حساب وغیرہ سیکھنے جایا کرتی تھیں۔ ان کی صلاح اور سعی سے مسلمان معلمہ حساب کے لیے مقرر ہوئی۔ امتحان اور مدرسہ کے معائنہ

کے لیے مرد آیا کرتے تھے۔ ان کی کوشش کا یہ نتیجہ ہوا کہ اب ممتحن اور معائنہ کنندہ سب لیڈیاں ہیں۔ مدرسہ کے کمروں میں بھی پردہ کے اعتبار سے انھیں کی صلاح و مشورہ سے بہت سی اصلاحیں ہوئیں۔

اُستانی صاحبہ اپنی شاگردوں کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتی تھیں اُن کی راحت کو اپنی راحت اور اُن کے دُکھ کو اپنا دکھ سمجھتی تھیں کسی شاگرد کو کسی دُکھ یا مصیبت میں دیکھا اور بے چین ہوگئیں۔ اُس کے لیے دُعائیں اور منّتیں ماننے لگیں۔ کسی شاگرد کے مرنے کی خبر سُنی اور رونے لگیں اور مُدّت تک اس کے خیال میں بے چین رہتیں۔ اُن کو کسی خاص شاگرد سے خصوصیت کے ساتھ محبّت نہ تھی۔ بلکہ ان کی محبت سب کے ساتھ یکساں تھی۔ یہاں تک کہ ہر ایک شاگرد اُن کو سب سے زیادہ اپنے اُوپر شفیق اور مہربان سمجھتی تھی۔ عمدہ بیگم۔ چاندنی بیگم بیگم جان۔ دولت النساء۔ زیبُ النّساء۔ زینب بی بی۔ جیواں فجاں۔ اُن کی قدیم عزیز شاگردیں ہیں۔ ان میں چاندنی بیگم جو بڑی نیک اور کم زبان لڑکی تھی اور جیواں دونوں کا انتقال ہوگیا۔ خدا ان دونوں کو بخشے۔ باقی شاگردوں کو اللہ اُن کی تقلید کی توفیق بخشے۔

میں نے بچشم خود ان کو عمدہ بیگم سے خصوصیت کے ساتھ بہت ہی محبت کرتے دیکھا اور ایک دفعہ وُہ خود کہتی تھیں کہ عمدہ مجھے اپنی بیٹیوں کی طرح عزیز ہے۔ جس طرح ماں بیٹیاں آپس میں

دُکھ سُکھ کہتی ہیں۔ اس طرح یہ دونوں اُستانی شاگرد آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اپنا دُکھ سُکھ کہتی اور صلاح و مشورہ کیا کرتی تھیں۔ اب کرچند دنوں سے اُستانی صاحبہ کو دانتوں وغیرہ کی تکلیف کے باعث مجلس میں مرثیے وغیرہ اچھی طرح نہیں پڑھے جاتے تھے تو ہر ایک مجلس میں عمدہ بیگم سے مرثیے پڑھوانے میں مدد لیا کرتی تھیں۔

گھر والوں اور خصوصاً شاگردوں پر اُن کا بڑا رعب تھا۔ مدرسہ میں شاگردیں ان سے بہت ڈرتی تھیں۔ ممکن نہ تھا کہ اُن کی موجودگی میں غیر جماعتوں میں شور ہونے پائے۔ حالانکہ نہ مارتی تھیں اور نہ بہت خفا ہوتی تھیں۔ صرف باتوں ہی میں اس قدر شرمندہ کرتی تھیں کہ لڑکیوں کو پھر اس خلافِ ادب حرکت کے کرنے پر جرأت نہ ہوتی تھی۔ کسی کمرے میں کچھ شور ہُوا اور اُن کا گزر اس میں اتفاقاً ہو گیا تو سب سہم کر خاموش ہو گئیں۔ یہ رُعب اُن کا صرف شاگردوں ہی پر نہ تھا۔ بلکہ اُستانیوں تک اُن کا رُعب مانتی تھیں۔

بیماری و انتقال

اُستانی صاحبہ اکثر بیمار رہتی تھیں۔ مگر ہمّت والی بڑی تھیں۔ اسی میں اپنے سارے کام خود کرتی اور کسی سے مدد نہ لیتی تھیں۔ اور جب بیماری بالکل غالب آجاتی تھی۔ تو چارپائی پر پڑ رہتی تھیں۔ اس حالت میں بھی یا تو کتب مصائب یا مرثیے پڑھتی رہتی تھیں یا کچھ سینا پرونا لیٹے لیٹے کیا کرتی تھیں۔ مرنے سے کوئی چودہ پندرہ دن پہلے دانتوں کے درد میں مُبتلا ہُوئیں۔ اسی میں مدرسے جاتی رہیں۔ بخار وغیرہ کچھ نہ تھا۔ مدرسے سے آکر اپنے معمولی کام میں مصروف ہو جاتی تھیں۔ جس سے گھر میں کسی کو یہ خیال بھی نہ ہوا۔ کہ مرض الموت کی یہی ابتدا ہے۔

اسی اثنار میں مدرسہ کی چھوٹی اُستانی صاحبہ کی صاحبزادی کا انتقال ہوگیا جس کا اُن کو نہایت صدمہ ہُوا۔ اور اگرچہ گھر کے سب لوگوں نے اُن کو میت میں شریک ہونے سے روکا۔ مگر کسی کی نہ سُنی اور اسی تکلیف میں ڈولی کرا اُستانی صاحبہ کے گھر پہنچیں۔ چونکہ وہ خود غم دیدہ اور زخم رسیدہ تھیں اور اس پر نہایت رقیق القلب تھیں۔ اس لیے وہاں اُن کو زیادہ صدمہ ہوا علاوہ اس کے بے آرام رہیں۔ دُوسرے دن جب طبیعت بہت بگڑی اور بخار ہوگیا تو وہاں سے گھر آگئیں دیکھا تو اُن کو بخار تھا۔ مگر یہی سمجھیں کہ معمولی بخار ہے۔ تکان کے باعث ہوگیا ہے۔ رفع ہو جائے گا۔ حکیم

صاحب نے نسخہ لکھ دیا - وہ ان کو دیا گیا - مگر اُن کو اِفاقہ نہ ہوا - اسی حالت میں تیسرا دن آگیا - اُس دن اپنے بڑے بھتیجے شریف حسین کو بہت یاد کرتی رہیں - جو لکھنؤ میں نارمل سکول سرکاری کے ہیڈ ماسٹر ہیں - اور ان دنوں میں موسم گرما کی تقریب پر لاہور آنے والے تھے - خدا نے اُن کی یہ آرزو بھی پوری کر دی - چارشنبہ کا دن تھا - دو بجے اُسی دن مع عیال وہ لاہور آگئے اور اُن سے مل کر بہت خوش ہوئیں - اور خدا کا شکر ادا کیا - کہ خدا نے اُن کی یہ آخری تمنا بھی پوری کر دی - اُس کے بعد باقی دن نہایت بے چینی میں گزرا - مگر ہوش برابر قائم رہے - قریب مغرب اُن کو جائے ضرور جانے کی حاجت ہوئی - ہرچند اُن سے عرض کیا گیا کہ چارپائی کے پاس چوکی رکھ دی جائے گی آپ یہیں فارغ ہو جائیں - مگر نہ مانا - اور بھاوج کی مدد سے پاخانے گئیں - فراغت کے بعد اس قدر ضعف ہوا - کہ پاخانے سے چارپائی تک آنا دشوار ہو گیا - بہزار دقت چارپائی تک پہنچیں اور کچھ دیر ضعف میں بیہوش پڑی رہیں - ہوش آیا - تو کہا نماز مغرب کا وقت ہے مجھے نماز پڑھوا دو - اُن سے کہا گیا کہ ابھی آپ کی طبیعت کمزور ہے اور نماز کا وقت بھی وسیع ہے ذرا تامل کیجئے - فرمایا کہ مجھے نہ روکو - نماز پڑھ لینے دو - خدا جانے پھر نماز کی طاقت مجھ میں رہے یا نہ رہے - غرض تیمم کیا اور مصلے پر باہر آئیں - اور بیٹھ کر فرض مغرب بین ادا کیے - اب چارپائی پر آکر طبیعت کچھ ایسی بگڑی کہ پھر نہ سنبھلی - مرنے سے تھوڑی دیر پہلے نزع شروع ہو گیا کوئی آدھ گھنٹہ یہ حالت رہی اور کچھ زبان سے کہتی رہیں مگر وہ سمجھ میں نہ آیا - اُن کے بھائی سرہانے

بیٹھے یٰسین پڑھتے رہے - دو دفعہ یٰسین کا دور ہو چکا تھا - کہ اُستانی صاحبہ نے پورے دو بجے شب پنجشنبہ ۶ ماہ صفر ۱۳۲۱ ہجری مطابق ۶ مئی ۱۹۰۳ء اس جہان فانی سے جنت الماویٰ کی طرف کوچ کیا - اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ صبح ہوتے ہی اُن کے انتقال کی خبر شہر میں مشتہر ہو گئی - حالانکہ اُن کے بھائی نے صرف جناب الحاج مولوی ابوالقاسم شاہ صاحب کو خبر بھیجی تھی - یا چند مومنین کو اس حال سے مطلع کیا تھا - کہ شریک جنازہ ہو کر ثواب حاصل کریں - اس پر بھی جنازہ تیار ہونے تک مکان پر لوگوں کی بہت بھیڑ ہو گئی - مدرسے میں خبر پہنچی تو مس بوس صاحبہ نے اسی وقت اس تقریب جان گداز کی تعظیم میں سارا مدرسہ اور شہر کے اور شاخ مدارس بند کر دیئے - ہندو مسلمان اُستانیاں بے حواس اور مضطربانہ دوڑیں - اور گھر میں آکر ایک کہرام مچا دیا - جس مکان میں مرحومہ رہتی تھیں - حالانکہ وہ بہت وسیع مکان ہے مگر صحن اور تینوں برآمدے اور باورچی خانہ عورتوں سے پٹا پڑا تھا - اور سب مرحومہ کے ماتم میں کھڑی رو رہی اور اکثر پیٹ رہی تھیں - مس بوس صاحبہ اور اُن کی بڑی بہن بھی تشریف لائیں اور مرحومہ پر اس طرح روئیں جیسے کوئی اپنے عزیز پر روتا ہے - اور جب تک غسل ہوتا رہا موجود رہیں - بعد تجہیز و تکفین اُن کی صورت سب کو دکھائی گئی - اُس وقت لوگوں کی بیقراری کی جو کیفیت تھی - بیان نہیں ہو سکتی - سب کھڑی پیٹ رہی تھیں - اور جس وقت اُن کے جنازہ پر نوحے پڑھے گئے اور ماتم حسینؑ ہوا - اُس وقت ایک کہرام پڑا ہوا تھا - کسی کو اپنی خبر نہ تھی - کوئی ہائے میری اُستانی کہہ کر روتی تھی اور کوئی ہائے

بی بی کہہ کر پیٹ رہی تھی۔ اسی کہرام میں جنازہ اُٹھنے اور مرحومہ کے اپنے عزیزوں اور نہایت شفیق ملاپ داروں سے ہمیشہ چھُٹنے کا وقت آگیا۔ اب اندر باہر ایک حشر برپا تھا۔ آخر مجبور روتے دھوتے اُن کے جنازہ کو لے چلے۔ ایک جمِّ غفیر جنازہ کے مشایعت میں تھا۔ بہت لوگ رستہ میں شریک ہُوئے اور ثواب حاصل کیا۔ مقبرۂ مومنین میں شاہ ابوالمعالی کے مقبرہ کے قریب دوپہر کے وقت پہنچے اور بعد نمازِ جنازہ نہایت رنج و قلق کے ساتھ اُن کے غمزدہ بھائی اور بڑے بھتیجے نے پردہ کے نہایت اہتمام کے ساتھ میّت کو قبر میں اُتارا۔ اور اس گوہر درج شرافت اور عصمت کو بصد حسرت و الم ہزاروں من مٹّی میں پنہاں کر کے نیم بسمل اور نیم جان گھر کو لوٹے۔ دنیا میں ہر ذی حیات کے لیے یہ دن درپیش ہے۔ خوشا حال اُن کا جس کا خاتمہ بخیر ہوا اور یہاں سے نیک نامی کے ساتھ اعمال نیک کا ذخیرہ لے کر رخصت ہُوئے اور اپنے پرائے کے دل میں محبّت کی بھری ہُوئی یاد چھوڑ گئے۔ خداوند اپنے حبیبؐ اور آل پاک کے صدقہ سے مرحومہ کو عاقبت میں مدارج اعلیٰ پر پہنچائے۔ اور خاتون جنّت کے جوار میں جگہ عطا فرمائے۔ جس کی اولاد کے غم میں وہ عمر بھر ماتم اور جان نثاری کرتی رہیں۔

اُستانی صاحبہ کے اخلاق اور عادات و خصائل

مرحومہ کی عام عادات اور خصائل پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک معمولی بی بی نہ تھیں۔ اُن کا طریق گزران۔ دین داری۔ محبّت و اخلاص خوش مزاجی و

نیک اخلاقی - خدا ترسی - یہ سب باتیں ایسی ہیں جن میں ہر بہن کو اُن کے نقش قدم پر چلنا چاہیئے - چنانچہ ہم اُن کے اخلاق کا کچھ مختصر ذکر سناتے ہیں۔

روزمرّہ کا طریق گذران

مرحومہ کا طریق گزران اور طرز معاشرت نہایت سادہ اور بے تکلّف تھا۔ اپنے لیے کبھی کوئی بات اپنی حیثیت سے بڑھ کر اختیار نہیں کی پچیس روپے ماہوار تنخواہ کے پاتی تھیں اور وطن سے جائداد کی بھی آمدنی آجاتی تھی مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ پُر تکلف پوشاک یا لذیذ کھانوں کی طرف رغبت ہوئی ہو۔ بسا اوقات باسی روکھی سوکھی روٹی پانی سے تر کر کے کھاتی اور خدا کا شکر کرتی تھیں - ہاں مہمان کے لیے جہاں تک ممکن ہوتا تھا تکلّف میں دریغ نہ ہوتا تھا - اپنے کپڑے دوسرے تیسرے دن آپ دھو لیا کرتی تھیں - کیونکہ کثیف اور میلے کپڑوں سے اُن کو طبعی نفرت تھی - پوشاک اس احتیاط سے پہنتی تھیں کہ ان کے کپڑے سالہا سال تک چلتے اور پہننے کے قابل رہتے - پوشاک سادی اور اپنے دیس کی پرانی قدیم وضع اور تراش کی پہنتی تھیں - زیور بہت پسند تھے - مگر اپنے دیس کے ہلکے اور سُبک - لڑکیوں کو زیور بڑی تاکید سے پہناتی تھیں اور فرمایا کرتی تھیں کہ اپنی دیس اور بزرگوں کی پوشاک وغیرہ ترک نہ کرنی چاہیئے -

گرمی کے موسم میں سفید غرارہ اور سفید کرتہ دوپٹہ پہنے رہتی تھیں - جاڑوں میں تنگ پاجامہ - مرینے کا کرتہ جو تقریباً چودہ گرہ لمبا ہوتا تھا - اور روئی کی ہلکی

رضائی اوڑھے رہا کرتی تھیں۔ پاؤں میں ہمیشہ ہندوستانی جوتی رہتی تھی۔

ان کی ایک شاگرد کا بیان ہے۔ کہ وہ آرسی بہت عرصہ تک پہنتی رہیں۔ اور وہ اس خیال سے کہ وہ آرسی کا پہننا شاید کسی مذہبی روایت کے خیال سے ثواب خیال کرتی تھیں۔

خانہ داری

خانہ داری کی اُن میں خُداداد لیاقت تھی۔ سینا پرونا۔ کھانا پکانا۔ برتنا برتانا اور ہر چیز کو قرینہ اور سلیقہ سے رکھنا۔ ان سب باتوں میں ہشیار تھیں۔

ضرورت کی ہر چیز گھر میں اس قدر موجود رکھتی تھیں۔ کہ اکثر اَوروں کے کام اُن سے نکلتے تھے۔ اخیر زمانہ میں بھی کہ گھر بے چراغ ہو چکا تھا صرف ایک اپنا دم رہ گیا تھا۔ تب بھی ضرورت کی کل چیزیں اور تکلف کا اکثر سامان گھر میں موجود رہتا تھا۔

گھر اور گھر کی ہر ایک چیز کی صفائی کا بے انتہا خیال تھا۔ گھر کو ہمیشہ آئینہ کی طرح صاف اور سُتھرا اور ہر چیز کو اُجلا رکھتی تھیں۔ گھر میں اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتی تھیں۔ اپنے ہاتھ سے ہر ایک چیز کو جھاڑتی پونچھتی تھیں اوروں کے ہاتھ کے کیے ہُوئے یہ کام انھیں پسند نہ آتے تھے۔ اسے اپنے ہاتھ سے کام کرنے کا شوق سمجھو یا غیرت مندی کا خیال۔ اس کا یہاں تک اثر تھا۔ کہ جب تک دل میں ہمت اور جسم میں طاقت رہی۔ اپنے سارے کام آپ کرتی رہیں۔ بھائی کے گھر روٹی یا ہنڈیا پکوانے کی بھی روادار نہ ہوتی تھیں۔

اور اگر ایسا کسی ضرورت سے کبھی ہوتا بھی تو بہت سے کام خود ہی کرتی تھیں جب طاقت نے جواب دے دیا تو تنور سے روٹی منگا کر کھانے لگیں کہ کسی کو اُن کی معذوری کی وجہ سے تکلیف نہ ہو۔

مرحومہ میں ایک بات کی البتہ کمی تھی وہ یہ کہ اپنی چیزیں سنگوا کر نہ رکھتی تھیں۔ صندوق اکثر کھلے رہتے تھے۔ کنجی لگانا ہی نہ جانتی تھیں۔ اور قفل لگائی بھی تو قفل میں ہی لگی چھوڑ دی۔ اس سبب سے اُن کی چیزیں اکثر تلف ہوتی رہتی تھیں۔

مولوی صاحب مرحوم کے زمانہ میں گھر کے خرچ کے لیے تیس روپے ماہوار مقرر تھے۔ اُن میں بڑے انتظام اور خوبی کے ساتھ سارے کام چلاتی تھیں۔ اور اُسی میں سے پس انداز کر کے زیور بھی بنوا لیتی تھیں۔ یہ اُن کے انتظام ہی کی خوبی تھی۔ کہ مولوی صاحب کے ایامِ علالت میں خرچ بڑھے ہوئے اور آمدنی قلیل تھی۔ مگر سب کام مثل سابق بلا دقت انجام پاتے رہے۔ بچوں کی تعلیم تربیت کے خرچ بھی اُٹھائے۔ اور بیماری کے مصارف بھی بیدریغ اُٹھائے مگر مولوی صاحب کو رقم مقررہ میں زیادتی کرنے کی تکلیف نہ دی۔

مولوی صاحب مرحوم کے زمانہ میں گھر میں مجلسیں نہ ہوتی تھیں۔ وہ اکثر وطن میں مجالس عزا کے لیے روپے بھیج دیتے تھے۔ اور لاہور کے امام باڑوں میں بھی مدد دیا کرتے تھے۔ مرحومہ نے مولوی صاحب کے بعد اُن کے سال وفات ہی سے زنانی مجلسیں شروع کر دیں۔ اور روز بروز اُن میں ترقی ہوتی گئی۔

اور مجلس کے خرچ بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ صرف ڈولیوں کے کرایہ میں اسّی نوّے روپے خرچ ہو جاتے تھے۔ تبرک بڑی سیر چشمی سے تقسیم ہوتا تھا اور خیال رہتا تھا۔ کہ کوئی محروم نہ جائے۔ خود اپنے ہاتھ سے بانٹتی تھیں۔ اکثر آنیوالیاں تین تین چار چار دفعہ تبرک لیتی تھیں اور مرحومہ ان کو بڑی خوشی سے دیتی تھیں پردہ والی بیبیوں میں سے اگر کوئی بے تبرک رہ بھی جاتی تھیں تو اُن کو بازار سے تازہ تبرک منگا کر بھیجتی تھیں۔ اکثر بیبیاں محرم میں مکان پر رہ جاتی تھیں اُن کے کھانے پینے کا خرچ اٹھاتی تھیں۔

غرض شوہر کے انتقال کے بعد بھی جس خوبی سے ۳۳ برس گزارے۔ اور لڑکیوں کا مرنا جینا۔ بڑی لڑکی کی شادی۔ دینا لینا۔ یہ سب باتیں جس سیر چشمی سے کیں۔ وہ فی الواقع حیرت انگیز ہے۔

مذہب کی پابندی

مرحومہ اپنے مذہب کی بڑی پابند تھیں۔ مگر اس پر نہایت بے تعصب تھیں۔ کسی سے مذہبی چھیڑ چھاڑ نہ کرتی تھیں۔ نماز روزہ کا ان کو بڑا خیال تھا۔ بیماری میں نماز قضا نہ کرتی تھیں۔ مرنے سے دو تین برس پہلے گھٹنوں کے درد نے اُن کو بہت تکلیف دے رکھی تھی۔ اس لیے اکثر بیٹھ کر نماز پڑھتی تھیں۔ مگر نماز صبح پھر کھڑے ہو کر ادا کرتی تھیں۔ روزہ اگر کسی سخت بیماری کی جہت سے قضا ہو جاتا تھا تو سال کے اندر اندر اُسے ادا کر لیتی تھیں جس دن مرحومہ نے انتقال کیا۔ اُس دن بھی فرائض روزانہ ادا کیے۔

فرائض یومیہ کے علاوہ وظائف اور اعمال مسنونہ کا نہایت خیال تھا۔ جو اوراد روزانہ کیا کرتی تھیں۔ وہ عمر بھر کرتی رہیں۔ درود شریف اور سورۂ اخلاص کی تسبیحیں روز بلاناغہ پڑھتی تھیں۔ مدرسے جانے آنے کا وقت اس ورد کے لیے مخصوص تھا۔ قرآن کی تلاوت روزانہ فرماتی تھیں۔ عید اور ایّام متبرکہ کے اعمال کبھی نہ ترک کیے۔ واجب اور مسنون روزوں کا بڑا خیال رہتا تھا۔ اگرچہ نذریں اور منّتیں ذرا ذرا سی بات پر عزیزوں اور غیر عزیزوں کی اکثر مان بیٹھتی تھیں۔ مگر ان سب نذروں کو پورا کرتی تھیں تین مہینے کے سنّتی روزے اُن کا معمول تھا۔ اُن کے علاوہ بہت سے روزے نذراللہ رکھتی تھیں۔ جب تک بدن میں طاقت رہی نماز تہجّد بھی پڑھتی رہیں۔ گھر کے بچّوں پر ہمیشہ نماز کی تاکید کرتیں۔ اور مسئلہ مسائل اور احادیث اور اخلاقی قصص سُناتی رہتی تھیں۔

اسی طرح ابتدائے عمر سے تادم آخر منہیّات شرعی سے پرہیز کرتی رہیں۔ میل ملاقات میں بیاہ شادی کی تقریبات پر جاتی تھیں۔ تو وہاں ڈومینوں کے گانے بجانے میں ہرگز نہ بیٹھتی تھیں۔ بلکہ اکثر صاحب تقریب اُن کے لحاظ سے جب تک وہ اُن کے گھر رہتی تھیں یہ باتیں نہ ہونے دیتی تھیں۔ رسومات فضول خلاف شرع کی اصلاح کا اُن کو بڑا خیال رہتا تھا۔ چنانچہ اخبار تہذیب نسواں میں جو انہوں نے مضمون دئے ہیں۔ اُن سے یہ بات ثابت ہے۔

استخارہ کی بڑی پابند تھیں۔ کوئی اہم بات بغیر اجازت استخارہ نہ کرتی

تھیں۔ ائمہؑ کی ذات بابرکات سے اُن کو بڑے خلوص کے ساتھ اعتقاد تھا۔ اور یہ اس خوش اعتقادی کا ثمرہ اُن کو اُن کے پاک پروردگار سے ملتا تھا کہ اُن کی دُعائیں اور منّتیں قبول ہوتی تھیں۔ مریض شفا پاتے تھے۔ بے روزگاروں کو روزگار۔ اور بے اولادوں کو اولاد ملتی تھی۔ لوگ اُن کو مستجاب الدّعوات مانتے تھے۔ اُن کے ہاتھ سے امام باڑے میں ڈوریاں بندھواتے اور اُن سے منّتیں منواتے تھے۔ اب کے محرم میں مرحومہ کا ہاتھ بہت تنگ تھا اور مجالس کی طرف سے بہت پریشان تھیں۔ آخر محرم سے دو تین دن پہلے گھبرا کر انہوں نے ایک عرضی اپنے حال اور پریشانی کی لکھ کر درگاہ میں ڈال دی اور رو رو کر دُعا مانگی۔ کہ اس محرم میں میری امداد کیجئے۔ یہ دُعا اور سب التجائیں جو اُن کی تھیں۔ حسب مُراد پوری ہوگئیں۔ وطن سے زمین کی آمدنی کی ایک معقول رقم آگئی۔ کھانا پکانے کے لیے غیب سے ایک عورت خُدا نے بھیج دی۔ غرض محرم کی مجالس کا سب انتظام محرّم سے پہلے ہوگیا۔ اور یہ محرم اس خوبی اور دھوم دھام سے ہوا کہ پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ ہر محرم میں وُہ کچھ قرضدار ہوجاتی تھیں۔ اس دفعہ کسی کی ایک کوڑی اُن کے ذمہ نہ ہوئی چنانچہ اس پر انہوں نے اپنے عزیزوں سے یہ کہا کہ اب کی دفعہ میں کسی کی مقروض نہیں ہُوئی اور ایسا کبھی اتفاق نہیں ہُوا کہ مَیں محرم میں قرضدار نہ ہوئی ہوں معلوم ہوتا ہے کہ میری زندگی کے دن پُورے ہوگئے۔ دوسرا محرّم مجھے نہ ہوگا الحمدللہ مولا نے دُنیا سے میرا مقروض اور ماخوذ الذّمہ اُٹھنا پسند نہ کیا۔ یہ بات کئی دفعہ انہوں نے دُہرائی اور اُن کے عزیزوں نے دل سے اُسے ٹالنا چاہا۔

مگر اُن کے اپنے خیال کے پورے ہونے پر یقین تھا۔ اور ویسا ہی ظہور میں آیا چنانچہ بعد فراغ مجالس محرم وہ بیمار ہوگئیں اور امام کے چہلم سے پہلے دنیا سے جنت کو سدھار گئیں۔ ذیل میں اُن کی عرضی لفظاً لفظاً درج ہے۔ جن سے اُن کی خوش اعتقادی ٹپکتی ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جناب آقا میرے۔ مولا میرے۔ ہادی میرے۔ رہنما میرے۔ جناب رسولِ خدا و جناب علیؑ مرتضےٰ و جناب فاطمہ زہراؑ و جناب امام حسن و جناب سید الشہدا مظلوم و بیکس شہیدِ راہِ خدا۔ جناب امام حسین علیہم السلام و دوازدہ امام میرے۔ عرض کنیزک کی یہ ہے کہ محرم عنقریب آیا۔ اور میری بے کسی کا حال آپ پر روشن ہے۔ بہ سبب نہ ہونے کسی ملازم کے سخت مجبور ہوں۔ اور اسی سبب سے آج تک کوئی کام نہ ہو سکا۔ آپ کی کنیز نہایت پریشان ہے۔ کہ کس طرح یہ کام سرانجام ہوگا۔ اب سوائے آپ کی امداد کے کوئی صورت نہیں۔ میں چاہتی ہوں حسب دل خواہ سب کام ہو جائیں۔ آپ معجز نما ہیں۔ میرے غریب خانہ میں آپ سب تشریف فرما کر ماتم داروں کو رونق بخشیں۔ ہر ایک ذاکر کے بیان پر ایسی رقت ہو۔ کہ جگر آدمیوں کے موم ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہوں۔ اوّل سے آخر تک مجلس پر رقت طاری رہے۔ اور خدا سے میرے واسطے دُعا فرمائیں۔ کہ جب تک میں زندہ

رہوں - آنکھوں کی روشنی اور دل کی طاقت بنی رہے - اور ہمیشہ مجلس کرتی رہوں - اور پڑھتی رہوں - اب مجھ کو اُمید نہیں ہے - جو مجلسیں میرے دل کی مراد کے موافق ہوں کیونکہ میں نادار ہوں - امداد کی طالب ہُوں مدد کرنا، مدد کرنا، مدد کرنا - آپ کی کنیز خاکسار اشرف - امداد کی طالب ہے - اور یہ بھی چاہتی ہوں - کہ سب اُستانیوں کی ترقی فرمائیں - کیونکہ یہاں اس محنت کا صلہ نہیں ہے -

عرضہ

بی اشرف النساء بیگم

پردے کی پابندی :-

اُستانی صاحبہ مرحومہ پردے کی ازحد پابند تھیں - اور اس کی پابندی میں حد سے زیادہ اہتمام کرتی تھیں - جب کبھی خاکسار کے گھر میں تشریف لایا کرتی تھیں - تو ڈیوڑھی میں ڈولی رکھوا کر کبھی نہیں اُترتی تھیں - بلکہ ہمیشہ ان کی ڈولی انگنائی میں سے گزر کر برآمدے کے اندر رکھی جاتی تھی - اس پر بھی بڑی مشکلوں سے ڈولی میں سے نکلتی تھیں - تب بھی ڈرتی ہُوئی اور سہمی ہُوئی کہ کہیں کوئی بے پردہ جگہ نہ ہو - ہرچند اُن کو یقین دلایا جاتا تھا کہ یہاں پردے کا پورا انتظام ہے - لیکن اُن کا دل ہرگز قبول نہ کرتا تھا - جہاں کسی نے ذرا دروازہ کھٹکھٹایا یا کسی مرد کی آواز آتی تمام جسم کانپ جاتا تھا -

اور فوراً چادر سے اپنے آپ کو چھپا لیتی تھیں۔

ایک دفعہ ان کے لیے ڈولی آئی تو ڈولی کے پردے میں دو تین ننھے ننھے سوراخ تھے۔ علاوہ ازیں پردہ کسی بہت موٹے کپڑے کا نہیں تھا چنانچہ انہوں نے اپنی ڈولی پر پہلے ایک دوتہی لپٹوائی۔ پھر چاروں طرف ایک اور گرم چادر لپٹوائی تب اُس میں بیٹھ کر گھر کو گئیں۔

کوئی کھیل تماشہ کبھی بھولے سے بھی انہوں نے نہیں دیکھا۔ اور جھانکنے وغیرہ کا تو کیا ہی مذکور۔ اپنی شاگردوں کو بھی پردے کی از حد تاکید رکھتی تھیں۔

محبّت و اخلاص

مرحومہ بڑی محبت والی تھیں اور اُن کی محبت نہایت درجہ کی خالص اور بے غرض ہوتی تھی۔ یہی سبب ہے کہ سب بیبیاں خود اُن سے راہ و رسم پیدا کرنے کی خواہش رکھتی تھیں۔ بڑے بڑے خاندان اور شرفاء شہر اپنی بہو بیٹیوں کو اُن کے گھر بے تکلف بھیج دیتے تھے۔ اور اُن کی خدمت میں بھیجنے کو فخر سمجھتے تھے۔

مولوی صاحب مرحوم کے زمانے میں اُن کی رسم صرف گنتی کے گھروں میں تھی۔ اُن کے بعد اُن کے اخلاق وسیع نے اس کو بہت بڑھا دیا۔ یہاں تک کہ نمود اور عزّت کے خاندانوں میں شاذ و نادر ہی کوئی گھر رہ گیا ہو گا جس سے ان کا میل ملاپ نہ ہُوا ہو۔ اور میل ملاپ بھی اس بے تکلّفی کا تھا کہ بے اطلاع

اور بن بُلائے لوگ اُن کے گھر چلے آتے تھے - اُن کو ہر بات کا بڑا خیال رہتا تھا۔ کہ جس گھر سے میل ملاپ ہوا ہے - وہ قائم رہے - اور اُن کی یہ آرزو ہمیشہ پوری ہُوئی کہ زندگی بھر کسی سے بگاڑ نہ ہُوا بلکہ روز بروز اس میل ملاپ میں ترقی اور مضبوطی ہوتی رہی - خاکسار اڈیٹر سے استانی صاحبہ مرحومہ کو نہایت محبّت تھی -

خاکسار کی سب سے پہلی مُلاقات اُستانی صاحبہ کے ساتھ اُن کی شاگرد عمدہ بیگم صاحبہ نے مورخہ ۲۰ مارچ ۱۸۹۸ء کو اپنے بھانجے کی منگنی میں کروائی تھی -

اُستانی صاحبہ پہلی ملاقات میں ہی مجھ سے اس قدر محبّت و اخلاق سے پیش آئیں کہ مجھے خاص اپنے بیٹھنے کی جگہ پر لے جا کر بٹھایا اور دیر تک باتیں کرتی رہیں - اُس دن کی ملاقات کو دن بہ دن ترقی ہوتی رہی اور آخر کار ملنا ملانا اس قدر بڑھا کہ وہ خاکسار کے ہاں کئی دفعہ تشریف لائیں اور میں بھی کئی مرتبہ اُن کے ہاں گئی - اُن کو مجھ سے اور مجھ کو اُن سے ایسی محبّت تھی - جیسے کسی اپنے عزیز رشتے دار کے ساتھ ہوتی ہے - باوجود اس کے کہ اس خاکسار میں اُن کے پاسنگ بھی لیاقت نہ تھی - وہ ہمیشہ اس ناچیز کی تعریفیں کرتی اور محبّت کا دم بھرتی تھیں اور نہایت عزّت سے پیش آتی تھیں - جب کبھی مَیں وکٹوریا گرل سکول میں جاتی آپ فوراً اپنے بیٹھنے کے مونڈھے پر سے اُٹھ کھڑی ہو جاتیں اور یہ اصرار کرتیں کہ تم میرے مونڈھے پر بیٹھو - مَیں نیچے فرش پر بیٹھوں گی - مَیں ایسی بزرگ بی بی کی شان میں ایسی گستاخی کب روا رکھ سکتی تھی - کہ خود

اُوپر بیٹھتی ۔ اور اُن کو نیچے بیٹھنے دیتی ۔ چنانچہ آخر کو یہ فیصلہ ہوتا ۔ کہ میں بھی فرش پر بیٹھتی اور وہ بھی جب تک میں وہاں رہتی وہ بھی برابر میرے ہمراہ رہتیں ایک دم کو مجھ سے جدا نہ ہوتیں ۔ رخصت کے وقت کبھی انہوں نے مجھے خوشی سے رخصت نہیں کیا ۔ وہ باربار یہی کہتی تھیں کہ تھوڑی دیر تو اور بیٹھو ۔ اُٹھتی اُٹھتی کا آنچل پکڑ لیتیں اگر اُن کی کوئی نواسی یا میری ملازمہ چلنے کا اشارہ کرتی تو آپ بہت آزردہ ہوتیں اور نہایت ناخوش دل سے رخصت ہونے کی اجازت دیتی تھیں ۔ اس پر بھی سیڑھیوں تک مجھے چھوڑنے آتیں ۔ چونکہ ٹانگوں میں اکثر درد کی شکایت رہتی تھی ۔ میں ہر چند عرض کرتی کہ آپ کو تکلیف ہوگی آپ آرام کریں مگر ہرگز نہ مانتیں ۔

۷ رجولائی ۱۹۰۰ء کو تہذیب نسواں کی سالگرہ تھی ۔ سب بہنوں نے نظمیں لکھ کر بھیجیں تو آپ نے بھی ایک طول طویل نظم لکھی جس کے چند شعر یہاں درج کرتی ہوں ۔ جس کے ایک ایک لفظ سے اُن کی سچی محبت ٹپکتی ہے بعد مناجات رب العالمین کے وہ فرماتی ہیں کہ :-

کرو صاحبو غور مل کر ذرا !!! — خدا کی عنایت نہیں ہے یہ کیا؟
سہیلی تمہاری اڈیٹر ہوئی — بھلے اور بُرے کی سمجھ اُن کو دی
خیال اُن کے دل میں یہ پیدا ہوا — کہ وہ کیجے جس میں ہو سب کا بھلا
اسی فکر میں رات دن رہتی تھیں — اسی فکر کی دُھن دُھنے جاتی تھیں
یہی دُھن رہی ایک مُدت لگی — تو بنیاد تہذیب کی ڈال دی
کہ اس کے وسیلے سے بہنوں کے راز — کھلیں ہم پہ تا ہم کریں اُن پہ ناز

جہاں تک ہے ہم اس میں کوشش کریں
دل و جاں سے بہنوں کی خادم بنیں
جو ہو ایک سے دوسری کا بھلا
دریغ اُس میں کرنا نہیں ہے روا
جہالت کے غاروں میں ڈوبے تھے ہم
سدا غوطوں پہ غوطے کھاتے تھے ہم
یہ ننھی سی جاں نے کیا حوصلہ
لیا بیڑا تہذیب کا تب اُٹھا
یہ بار گراں تھا۔ کچھ آساں نہ تھا
مگر رحمتِ حق سے آساں ہوا
نصیحت پہ اُن کی عمل سب کرو
تہ دل سے ممنون و مشکور ہو
اشارے پہ انسان کے حیواں چلیں
غضب ہے نہ انساں نصیحت سنیں
پھلے اور پھولے اڈیٹر مری !!
ہو اقبال والی اڈیٹر مری !!!
الٰہی تری دُنیا جب تک رہے
ہمیشہ یہ فیض اُن سے جاری رہے
نہیں رُکتا ہوں یہ میرا قلم
مناسب ہے مانگیں دُعا مل کے ہم
ادا شکریہ اُن کا کس طرح ہو
دُعائیں کروں تم سب آمیں کہو
جو دُشمن ہوں اُن کے وہ مقہور ہوں
جو ہوں دوست اُن کے۔ وہ مسرور ہوں

تہذیبِ نسواں سے مرحومہ کو دلی اُنس تھا۔ اور خاکسار کی پاس خاطر سے وہ ہمیشہ اس میں مضمون لکھتی رہتی تھیں۔ چنانچہ وقتاً فوقتاً اُنھوں نے تہذیب نسواں میں حسب ذیل مضمون لکھے تھے:۔

جلد	تاریخ بقید سنہ	نام مضامین	صفحہ اخبار
۲	۱۳ جنوری ۱۸۹۹ء	لڑکیوں کی تعلیم کی ضرورت	۹

جلد	تاریخ بقید سنہ	نام مضامین	صفحہ اخبار
۲	۲۳ مارچ ۱۸۹۹ء	میں نے لکھنا پڑھنا کیونکر سیکھا	۹۰
〃	۳۱ 〃 〃	〃	۹۷
〃	۷۔ اپریل ۱۸۹۹ء	کیا ہم بے وفا ہیں؟	۱۰۵
〃	۱۴ 〃 〃	شادی میں بے جا رسمیں	۱۱۷
〃	۲۱ جولائی ۱۸۹۹ء	چھوٹا سفرنامہ	۲۳۳
〃	۴۔ اگست ۱۸۹۹ء	ایک امیر لڑکی کا قصہ	۲۴۳
〃	۱۴۔ اکتوبر ۱۸۹۹ء	غصہ	۳۲۲
〃	۲۱ 〃 〃	سیر لکھنؤ	۳۲۹
〃	۲۸ 〃 〃	〃	۳۳۷
۳	۱۳ جنوری ۱۹۰۰ء	فرزندی میں لینا	۱۱
〃	۲۰ 〃 〃	ناز کی خرابیاں	۱۹
〃	۷ جولائی ۱۹۰۰ء	نظم سالگرہ	۲۱۴
〃	یکم ستمبر ۱۹۰۰ء	بچوں کو افیم	۲۷۵
〃	۹ 〃 〃	مانگے تانگے کا کپڑا	۲۸۲
۴	۱۲ جنوری ۱۹۰۱ء	خط	۱۱
۵	۲۴ مئی ۱۹۰۲ء	خدا کی شکر گزاری	۱۶۴
〃	۶ دسمبر ۱۹۰۲ء	ریویو۔ انمول موتی و صفیہ بیگم پہ	۳

استانی صاحبہ اپنی ایک عزیز سے کہا کرتی تھیں کہ جب میں نے لکھنا پڑھنا سیکھا تو میرے چچا مجھ سے بہت ناراض ہوئے۔ مَیں نے اُن سے معافی طلب کی اور اقرار کیا کہ انشاء اللہ میں کسی مرد یا بیاہی ہوئی غیر عورت کو کبھی خط نہ لکھوں گی۔ اس اقرار کو میں نے بہت عرصہ تک پورا کیا۔ لیکن آخر کو میری قسم آڈیٹر تہذیب نسواں پر ٹوٹی۔ ورنہ اس سے پیشتر کبھی کسی بیاہی عورت کو خط نہیں لکھا تھا۔ اگر ضرورت پڑتی بھی تھی تو اپنی شاگردوں یا کسی اور سے لکھوا دیا کرتی تھیں۔

استانی صاحبہ کی ایک عزیز شاگرد کا بیان ہے کہ وہ ایک دفعہ کہتی تھیں کہ کیا کروں بعض لوگ کہتے ہیں کہ اہل سنّت سے دلی محبّت کرنا اہل شیعہ کے لیے گناہ ہے۔ مگر مجھے تو محمدی سے دلی اُلفت ہے اور اگر وہ شیعہ بھی ہوتی تو مَیں اسے اپنے کلیجے میں اُٹھا کر رکھ لیتی میں نے یہ بات سُنی اور دل میں رکھی۔ اگست ۱۹۰۴ء میں جب کہ میں انبالہ دہلی وغیرہ مقامات میں گئی۔ انہی دنوں میں استانی صاحبہ بھی اپنے وطن کو تشریف لے گئیں۔ چنانچہ دو ڈیڑھ ماہ تک اُستانی صاحبہ کا کوئی خط میرے پاس نہ آیا۔ مَیں نے اس فراموشی کی شکایت کی اور منجملہ دیگر باتوں کے اشارتاً یہ بھی لکھ دیا۔ کہ کیا شیعہ مذہب میں اہل سنّت سے سچّی محبّت کرنا گناہ سمجھا جاتا ہے؟ لیکن میری التجا ہے۔ کہ آپ اگر مجھ سے محبّت نہ بھی کریں تو بھی اپنی خیریت سے تو ضرور مجھے شاد فرمایا کریں اس پر انہوں نے مجھے جو خط لکھا۔ اس کی یہ نقل ہے :-

برخورداری عفیفہ میری پیاری بی بی محمدی بیگم طول عمرہا

بعد دعا کے واضح ہو عزیزۂ من آپ کی شکایت میرے سر آنکھوں پر۔ کیونکہ جس سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ اُسی سے شکایت بھی ہوتی ہے۔ میں آپ کی اس محبت بھری شکایت سے بہت خوش ہوئی۔ اور اب آپ کی محبت نے اور بھی زیادہ دل میں گھر کر لیا۔ خدا نخواستہ مجھ کو آپ سے کیوں رنج ہوتا؟ خط نہ لکھنے کا یہ سبب ہوا کہ مجھ کو آپ کا پتہ معلوم نہیں تھا۔ اور آپ کو میرا پتہ معلوم تھا۔ میں اس بھروسے پر رہی۔ کہ آپ جہاں جائیں گی۔ وہاں سے مجھے خط ضرور تحریر کریں گی۔ میں وطن میں ایک ماہ تک رہی وہاں ایک دم کو فرصت نہ ہوئی۔ دن رات میں تین چار مجلسیں ہوتی تھیں۔ کوئی ایسا وقت نہ ملتا تھا کہ آپ کو خط لکھتی۔ الہ آباد میں گئی تو آپ کے خط کی منتظر رہی۔ جب آپ کا اور برخورداری عمدہ بیگم کا کوئی خط نہ آیا تو طبیعت نہایت پریشان ہوئی۔ مجبور ہو کر برخورداری بیگم جان کو خط لکھا اور اُس میں آپ کے نام کا بھی ایک پرچہ لکھا اور یہ تاکید کی کہ جہاں وہ دونو ہوں۔ یہ پرچہ پہنچا دینا۔ انہوں نے کچھ جواب نہ دیا۔ اب آپ انصاف فرمادیں کہ میرا اس میں کیا قصور ہے؟ یہ غفلت بیگم جان کی ہے اور اگر آپ کے خیال میں میری ہی بے پروائی ہے۔ تو معاف کریں۔ مجھ کو جس قدر آپ سے محبت ہے۔ بلکہ آپ کی سب عزیزوں سے خدا پر خوب روشن ہے۔ اور یہ اس محبت کا ہی سبب ہے جو میں آپ کو خط لکھتی ہوں ورنہ میں نے اپنے عزیزوں سے بھی اس طرح کی خط وکتابت کبھی نہیں کی جس

طرح آپ سے کی ہے۔ آپ ہرگز یہ گمان نہ فرمادیں جو آج کل آپ کے دل میں سمایا ہے۔ اور نہ ہی ہمارے مذہب میں یہ لکھا ہے کہ کسی دوسرے مذہب والے سے دلی محبت نہ کرو۔ ہاں یہ ضرور لکھا ہے کہ دشمنانِ اہلِ بیتؑ سے دوستی نہ کرو۔ سو یقین ہے کہ اس امر کو تو آپ بھی مانتی ہونگی۔ میں نے بہت کتابیں اہل سنّت کی دیکھی ہیں۔ وہ بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں مومن مسلمان کو کہتے ہیں۔ نہ کہ صرف ایک شیعہ کو۔ مجھ کو تو آپ کے ساتھ دلی محبت ہے خواہ آپ کو یقین آئے یا نہ آئے اگر آپ کو میری محبت کا یقین نہیں ہے۔ تو کیا برخورداری عمدہ بیگم کو بھی آپ سے دلی محبّت نہیں ہے۔ وہ بھی تو آخر شیعہ ہے اگر آپ سے محبت نہ ہوتی تو وہ آپ کے ساتھ بیگانے شہر میں کبھی نہ جاتی بس آپ اس خیال کو اپنے دل سے دور کردیں۔"

اُستانی صاحبہ کو باوجود شیعہ ہونے کے مجھ سے جو محبت تھی۔ سو اُوپر کے بیان سے بخوبی ظاہر ہو سکتی ہے۔ یہی حال میرا تھا۔ کہ مجھے بھی اُن کے مذہب کا رتّی برابر خیال نہ تھا ان کی عزّت و تعظیم میرے دل میں اس قدر تھی کہ شاید کسی مرید کو اپنے پیر کی بھی نہ ہو گی۔ میرا عقیدہ ان پر ایسا تھا۔ جیسے کسی ناچیز کا خُدا کے برگزیدہ بندے پر ہونا چاہیئے۔ دُکھ میں۔ بیماری میں۔ رنج میں۔ تکلیف میں۔ ہر حالت میں۔ میں اپنی ناچیز دُعا۔ کے بعد اُن کی طرف رجُوع کرتی تھی کہ وہ خُدا سے میرے واسطے دُعا کریں۔ چنانچہ وہ میری بہتری کے لیے سچّے دل سے دُعائیں مانگتیں اور منّتیں مانتی تھیں۔ اور چونکہ وہ خُدا کی نیک اور پاک بندی تھیں۔ اس

واسطے خدا اشرف کی دُعا کو ضرور شرف قبولیت بخشتا تھا۔ اور میں اپنے تفکرات سے نجات پاتی تھی۔

سنہ ۱۹۰۵ء کے اخیر میں جبکہ امتیاز پیدا ہونے والا تھا۔ ان دنوں میں اتفاق سے میرے عزیزوں میں سے کوئی بی بی میرے پاس موجود نہ تھیں اور نہ بعض وجوہات کے باعث کوئی آ ہی سکتی تھیں۔ اُستانی صاحبہ کی عزیزہ شاگرد عمدہ بیگم صاحبہ معلّم چہارم وکٹوریا گرل سکول کے ساتھ میرا تعلق ہمیشہ سے بہنوں کا سا رہا۔ اس موقع پر بھی اُن کی مدد کا بہت کچھ بھروسا تھا۔ مگر اتفاق ایسا پیش آیا کہ ان کو بھی اسکول سے چھٹی نہ مل سکی اور وہ نہایت رنجیدہ خاطر اور مجبور ہو کر خاموش ہو رہیں۔

جب اُستانی صاحبہ نے یہ سُنا۔ کہ عمدہ بیگم صاحبہ کو چھٹی نہیں ملی تو میری تنہائی پر نہایت افسوس کیا اور دُعا کی کہ خدا کرے کہ بچے کے ہونے کا دن ایسا ہو کہ اس روز اسکول میں چھٹی ہو اور عمدہ بیگم اُن کے ہاں جا سکیں۔ خدا نے اُن کی دُعا کو قبول کیا۔ اور وہی ہوا۔ کہ امتیاز مورخہ ۱۳۔ اکتوبر سنہ ۱۹۰۵ء کو ہفتے کا دن گزار کر ۸ بجے شب کے تولد ہوا۔ صبح اتوار کا دن تھا۔ ہمشیرہ عمدہ بیگم صاحبہ امتیاز کے ہونے میں شامل ہو گئیں اور ان کے ہونے سے مجھے بہت ہی آرام ملا۔ جب پیر کے دن وہ اسکول گئیں۔ تو اُستانی صاحبہ مرحومہ نے ذیل کے مضمون کا خط میرے نام بھیجا۔

برخورداری عزیزہ عفیفہ بی بی محمدی بیگم طول عمرہا و زاد قدرہا

عزیزہ عمدہ بیگم کی زبانی یہ معلوم ہوا۔ کہ ہمشیرہ کے یہاں ساتھ خیر کے

فرزند ارجمند تولّد ہوا۔" اس خوش خبری کو سُن کر نہایت خوش ہوئی۔ الحمد للہ
کہ وہ خوش خبری کہ جس کی امید مدت سے لگی ہوئی تھی۔ میرے خُدا نے سُن
لی۔ اب خُدا سے یہ دُعا ہے۔ کہ اس عزیز کی عمر میں برکت دے۔ اور نیک و
صالح اور نیک نصیب کرے۔ اور والدین کو اس کی خوشیاں دیکھنی نصیب
ہوں۔ آمین۔ ثم آمین۔ میری طرف سے آپ کو اور سب کو خوشی کی مبارکباد
پہنچے۔ ہمارے ہاں سب مبارک باد دیتے ہیں۔ میری طرف سے پیارے بچے
کو بہت بہت دُعا پیار پہنچے۔

آپ کی اس تنہائی کا جس قدر مجھ کو صدمہ ہے خُدا پر خوب روشن
ہے۔ تحریر کرنے کی حاجت نہیں۔ میں نے تو برخورداری عمدہ بیگم سے کہا تھا
کہ اگر مجھ کو منظور کریں۔ تو جس وقت خبر کریں میں حاضر ہوں۔ مگر یقین نہیں
کہ مجھ کو بہ سبب لحاظ کے منظور کریں۔ کیونکہ جو کام اپنی ہم عمر سے نکلتا ہے وہ
بڑوں سے نہیں نکلتا۔ خیر خُدا نے آپ کی مشکل آسان کر دی اور جو باقی ہے۔
وہ بھی اس کی مدد سے انشاء اللہ آسان ہو جائے گی۔

جس وقت عمدہ بیگم نے مجھ کو یہ سُنایا تھا۔ کہ مجھے اسکول سے چھٹی
نہیں مل سکتی۔ اُس وقت مجھے نہایت سخت صدمہ اور رنج ہوا کہ ایسے وقت
میں دشمن بھی ہمدردی کرتے ہیں۔ یہاں دوست بھی معذورجی کے باعث کنارہ
کر گئے۔ یہ سوچ کر میرا دل ایسا بے قرار ہوا کہ بے اختیار میرے منہ سے یہ
دُعا نکلی۔ اے کریم و رحیم تیرا کام رحم کرنا ہے۔ بتصدق ائمہؑ اطہار کے۔ جس
روز وہ نیک ساعت آئے۔ وہ ہفتہ کا آخر دن ہو یا اتوار کا دن۔ تاکہ عمدہ بیگم

مدرسہ سے فارغ ہو کر گھر جا چکی ہو۔ اس وقت اُن کے ہاں سے آدمی عمدہ بیگم کو بلانے آئے۔ اور عمدہ بیگم فوراً چلی جائے اور کوئی حیلہ وحجت نہ ہو۔ وہ ایسی قبولیت کی ساعت تھی۔ کہ خدا نے میری دُعا قبول کر لی اور دلی مراد بر آئی۔ آپ اس خط کا جواب لکھنے کی تکلیف نہ کریں۔ والدعا۔"

مجھ کو ستمبر ۱۹۰۱ء کا واقعہ کبھی نہیں بھولے گا جبکہ امتیاز اب سے دو روز عارضہ نمونیا میں مبتلا ہو گیا اور اس کی جان کے لالے پڑ گئے میں نے مایوس ہو کر اس کی آخری تصویر اُتروائی۔ اس حالتِ مصیبت میں ہر ایک بہن نے نہایت ہمدردی سے بچے کے لیے دُعائیں کیں۔ مگر اُستانی صاحبہ مرحومہ نے جس سچے دل سے امتیاز کے لیے دُعائیں مانگیں اور منتیں مانیں میرے روئیں روئیں سے دُعائیں نکلتی ہیں۔ کہ خدا اُن کو اس کے عوض فردوس بریں میں جگہ دے اور ان کی روح پر اپنی رحمت کا سایہ کرے۔ آمین۔ خدا کو اس بچے کی زندگی منظور تھی۔ اُس نے ان کی دُعائیں قبول کیں اور بچے کو صحت کُلّی بخشی۔

اُستانی صاحبہ مرحومہ امتیاز علی کو ہمیشہ امتیاز حسین کہا کرتی تھیں۔

سنہ ۱۹۰۲ء کے اخیر میں مَیں نے اپنی تصنیف شدہ دو کتابیں انمول موتی اور دُوسری صفیہ بیگم بطور ہدیۂ ناچیز کے پیش کیں۔ جن کو پڑھ کر مرحومہ اس قدر خوش ہوئیں۔ کہ جس کا بیان نہیں۔ چنانچہ اس موقع پر انہوں نے جو خط مجھے لکھا۔ اس کی مختصر نقل یہ ہے :-

برخورداری عزیزہ عفیفہ محمدی بیگم زادعمرہا

بعد دُعا کے واضح ہو۔ کہ آپ کی تصنیف شدہ کتابیں انمول موتی اور صفیہ بیگم مجھے ملیں۔ اُن کے مطالعہ سے دل نہایت خوش ہوا۔ اور دل سے بے اختیار دُعائیں نکلیں۔ خدا وند کریم آپ کی عمر اور حوصلے میں برکت دے اور دونوں جہان میں خوشیاں دیکھنی نصیب کرے۔ آپ نے ہم عورتوں کی بہبودی کے لیے کیا نہیں کیا؟ ہم ناقص العقل مستورات میں آج تک کوئی بی بی اس لیاقت کو نہیں پہنچی اس زمانے میں اخبار کی اڈیٹر ہیں تو آپ ہیں۔ اور نظم و نثر کی مصنفہ ہیں تو آپ۔ کتابیں بھی تصنیف کیں۔ تو اس خوب صورتی کے ساتھ۔ کہ نقطے نقطے اور فقرے فقرے سے بارانِ رحمت کی طرح تہذیب و سلیقے کی بوندیں برستی ہیں۔ خصوصاً انمول موتی تو جواہرات سے بڑھ کر گراں بہا ہے اسے اگر ہم دن رات بطور وظیفے کے ورد کریں تو دل کی جہالت کی تاریکی سے جلا دے کر نورانی کر دے۔ اگر سرکار ان کتابوں اور رفیق عروس کو بھی لڑکیوں کے مدرسے میں پڑھانا لازمی کر دے۔ تو لڑکیوں کے لیے نہایت مفید ہو کیونکہ ان کتابوں میں وہ وہ نصیحتیں اور فرائض ہیں جن کا ادا کرنا ہر انسان پر فرض ہے۔ اگر میری یہ درخواست منظور ہو جائے تو عفیفہ کی قدرشناسی ہمارے لیے موجب فخر ہوگی۔ آپ نے جو اس نیک کام میں اپنا وقت خرچ کیا ہے۔ خدا کی جناب میں اُس کا صلہ ملے گا۔ بندوں سے داد ملنی محال ہے۔" فقط

انہوں نے نہ صرف یہ تحریر ہی میرے پاس بھیجی۔ بلکہ پچاس جلد انمول موتی اور دس جلد صفیہ بیگم بھی منگا بھیجیں اور اُن کو اسکول میں

فروخت کر کے اُس کے دام میرے پاس بھجوا دئے - اس کے بعد ایک روپیہ کے انمول موتی اور منگائے اور مفت تقسیم کیے - اس سے بھی زیادہ یہ کوشش کی کہ ممبران کمیٹی انتظامی وکٹوریا گرل سکول کو اس مضمون کی عرضی دی کہ میری تینوں تصنیف شدہ کتابیں وکٹوریا سکول کی پڑھائی میں داخل ہو جائیں - افسوس کہ اس عرضی کے منظور کروانے میں ابھی وہ کوشش ہی کر رہی تھیں کہ اجل کا پیغام آ پہنچا اور اُن کی یہ حسرت دل کی دل میں رہ گئی اگر وہ زندہ رہتیں - تو ضرور ان کتابوں کو منظور کرواتیں - اور جب وہ منظور ہو جاتیں - تو اس قدر خوشی مجھے نہ ہوتی جس قدر کہ خود اُن کو ہوتی -

میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ اُن کو صرف مجھ سے ہی ایسی محبت تھی - بلکہ وہ ہر ایک سے دلی محبت و اخلاق کے ساتھ پیش آتی تھیں اور میں نہیں جانتی کہ میرے جیسی اور کس قدر بہنیں ہوں گی جن کو وہ میرے برابر یا مجھ سے بھی زیادہ چاہتی ہوں گی - ان کے اخلاق نہایت وسیع تھے اور طبیعت میں اس قدر انکسار تھا کہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کو اپنے سرہانے بٹھا لیتی تھیں نوکروں کے ساتھ مل کر ایک دسترخوان پر کھانا کھاتی تھیں اور فرمایا کرتی تھیں کہ خدا کے بندے سب برابر ہیں بزرگی اور شرافت صرف علم و ہنر کی ہے یا اعمال کی - سو میں دیکھتی ہوں کہ مجھ میں کوئی خاص فضیلت نہیں اور بالفرض اگر مان بھی لی جائے تو اوروں کو ذلیل اور حقیر سمجھنے اور اُن سے کھچنے کے لیے یہ کوئی دلیل نہیں - پیرن جو اپنی تندرستی

کے زمانے میں مرحومہ کے کام کاج کر دیا کرتی تھی وہ غریب دو اڑھائی برس سے اندھی ہو گئی۔ وہ کئی دفعہ ان کے مکان پر آکر مہینہ مہینہ دو دو مہینے رہی۔ اس عرصے میں وہ اس کی اس طرح خدمت کرتی تھیں جیسے لونڈیاں اپنی بی بی کی کرتی ہیں۔ اس کا سر دھوتی تھیں۔ نہلاتی تھیں۔ پاخانے میں خود لے جاتی تھیں۔ اور اس کی مصیبت پر اکثر رویا کرتی تھیں۔ گھنٹوں ان سے باتیں کیا کرتی تھیں۔ کوئی بچہ اس کو ستاتا تھا۔ تو کہا کرتی تھیں۔ کہ خدا سے ڈرو۔ وہی پیرن ہے جو تمہارے کام کیا کرتی تھی۔ ایسا نہ ہو۔ کہ خدا ہماری اس بے دردی پر ناراض ہو۔ اور ہم کو کسی مصیبت میں گرفتار کرے۔ ہماری صحت اور تندرستی کا شکریہ یہ ہے کہ ہم اس کے دکھی بندوں پر ترس کھائیں اور اُن پر رحم کریں۔ مرحومہ خوش یقین اس درجہ کی تھیں۔ کہ عمر بھر کسی پر بدگمان نہ ہوئیں۔ کسی کی رسوائی کی بات سُنی اور سو سو طرح سے اس الزام کے دفع کرنے پر آمادہ ہو گئیں کسی کی غیبت پر کان نہ دھرتی تھیں بلکہ غیبت کرنے والے پر افسوس کرتی تھیں اور اس کو اس حرکت سے باز رہنے کی ہدایت اور تلقین کرتیں اور آخرت کے مواخذہ سے اُسے ڈراتیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ کہ عشرۂ محرم میں جبکہ آپ تبرک بانٹ رہی تھیں۔ اور مساکین عورتوں کی بھیڑ چاروں طرف جمع تھی تو چند عورتوں نے اس بات پر کہ ہم کو تبرک تھوڑا دیا ہے۔ استانی صاحبہ کو اور توشے کے نانوں کی چنگیر کو گرا دیا اور بعض بے تمیز بیباک عورتوں نے استانی صاحبہ کو مارنا شروع کیا۔ جب اُن کا ایک پہلو مار کھاتے کھاتے تکلیف

سے سُن ہو گیا تو آپ بولیں کہ اے نیک بیبیو! ایک ہی جگہ تو مت مارے جاؤ۔

آج کل کے زمانے میں کون ایسی بی بی ہے جو بھری مجلس میں یوں مار کھائے اور مارنے والے کو دُعا دی جائے۔

۱۹۰۲ء کا ذکر ہے کہ اسکول کی بعض لڑکیوں نے مل کر ڈولی کے کہاروں کی کچھ شکایت کی۔ اُس پر اُستانی صاحبہ نے خود ہی اسکول کے چپڑاسی کو بلا بھیجا۔ کہ کہاروں کو سمجھا دو۔ کہ وُہ لڑکیوں کو لانے لے جانے میں تکلیف نہ دیا کریں۔ چپڑاسی نے جواب دیا۔ کہ کہاروں کی جو مرضی ہو گی ویسا ہی کریں گے اُستانی کی جو مرضی ہو کریں۔ اس سخت گُستاخی کے جواب کو سُن کر اُستانی صاحبہ کو اس قدر صدمہ ہوا۔ کہ غشی کی نوبت پہنچ گئی مس بوس صاحبہ اور ان کی بہن دوائیں وغیرہ لائیں۔ اور ان کا علاج کیا جب ذرا افاقہ ہوا۔ تو ڈولی میں بٹھا کر بھیج دیا۔ اُستانی صاحبہ مرحومہ کو اپنی شاگردوں کی تکالیف کا خیال کرنے اور کہاروں اور چپڑاسی کی نافرمانی سے ایسا سخت صدمہ ہوا کہ انہوں نے استعفا لکھ کر بھیج دیا۔ مس بوس صاحبہ نے استعفا نامنظور کیا لڑکیوں کی زبانی مس صاحبہ نے سب حال سُن لیا تھا لیکن پھر بھی انہوں نے چاہا کہ اُستانی صاحبہ کی زبانی اُن باتوں کو سنوں۔ مگر انہوں نے چپڑاسی کی رتّی بھر بھی شکایت نہ کی اور استعفا دینے کی یہ وجہ بتائی کہ مَیں بہت کمزور ہو گئی ہوں اور مجھ سے اب استانی کی ذمہ داری ادا نہیں ہو سکتی۔ مس صاحبہ نے اُن کی اس عادت پر اَور بھی زیادہ قدر کی

کہ انہوں نے چپڑاسی کی ذرا بھی شکایت نہیں کی۔

اس کے بعد مس صاحبہ نے چپڑاسی کو بُلایا اور موقوف کر دیا اور اُستانی صاحبہ کو خط پر خط لکھ کر اسکول میں بلایا۔ جب اُستانی صاحبہ اسکول میں آئیں تو انہوں نے یہاں آکر سُنا کہ چپڑاسی کو مس صاحبہ نے موقوف کر دیا ہے اور صرف تین دن اُس کے جانے کے باقی رہ گئے ہیں۔ یہ سُن کر اپنی ایک عزیز شاگرد کو مس صاحبہ کے پاس بھیجا۔ کہ چپڑاسی کا قصور معاف کر دو مگر مس صاحبہ نے کہا کہ وہ معاف کر دیں لیکن مَیں معاف نہیں کروں گی۔ یہ سُن کر اُستانی صاحبہ اب خود مس صاحبہ کے پاس تشریف لے گئیں اور وہاں جا کر رونے لگیں۔ کہ اس غریب کو اگر نکال دیا گیا تو وہ کیا کرے گا؟ کہاں سے کھائے گا۔ یہ کہہ کر بہت منّت کی کہ اسے اس کی نوکری پر بحال کر دیں مس صاحبہ ہنس پڑیں۔ اور قصور معاف کر دیا۔

ایک دفعہ گرمی کے موسم میں ہمارے ہاں تشریف لائیں پنکھا قلی پنکھا کھینچ رہا تھا۔ آپ نے جھٹ اُسے کہلا بھیجا کہ پنکھا چھوڑ دے اور آرام کر۔ پنکھا قلی نے پنکھا چھوڑ دیا اور اُس کی بجائے خود پنکھا جھلنے لگیں۔ مَیں نے ہر چند اصرار کیا کہ پنکھا قلی کو پنکھا کھینچنے دیں۔ مگر ہرگز منظور نہ کیا اور کہا۔ کہ وہ بھی بیچارہ آدمی ہے۔ اُسے بھی آرام دینا چاہیئے۔ اور یہ بھی کہا کہ جن دنوں میرے شوہر زندہ تھے۔ انہوں نے ایک چھوٹا لڑکا پنکھا کھینچنے کے لیے رکھا ہُوا تھا جب میں دیکھتی کہ مولوی صاحب سو گئے ہیں۔ فوراً اس لڑکے کو سُلا دیتی تھی اور اُس کی جگہ خود پنکھا کھینچنے لگتی تھی۔

رقیق القلبی :-

رقیق القلبی اور دل کی کمزوری کا یہ حال تھا کہ ذرا سے کھٹکے سے بھی کانپ اٹھتی تھیں اور فوراً دُعائیں پڑھنے لگتی تھیں۔ مینہ، آندھی، بجلی کی کڑک، بادلوں کی گرج اور انجن کی سیٹی سے ڈر جاتی تھیں اور سب کو جمع کر کے اپنے پاس بٹھا لیا کرتیں اور بار بار خدا کے فضل اور رحمت کی دُعائیں مانگتیں۔

رحم دلی :-

رحم دل اس درجہ کی تھیں کہ کسی کو مصیبت یا پریشانی میں دیکھا اور بے چین ہو گئیں۔ کسی کے دَرد دُکھ کی بات سُنی اور بے قرار ہو کر رونے لگیں۔ جہاں تک اُن سے ہو سکتا تھا۔ دامے، درمے، قدمے، قلمے اُس کی امداد اور رفع تکلیف میں سعی کرتی تھیں۔ اُن کی رحم دلی کا دامن اس قدر وسیع تھا کہ اپنے پرائے ملّت و غیر ملّت والے سب بلا تمیز و تفریق اس میں مساوی حصّہ پاتے تھے۔ اکثر ایسا ہُوا کہ جن سے اُن کو سخت تکلیفیں اور اذیتیں پہنچیں، وقت پر اُن کے آڑے آ گئیں اور اُن کے ساتھ سلوک کیے اور لطف یہ کہ کسی کے سامنے اپنے اس احسان اور اُس کی بدسلوکی کا اظہار نہ کیا۔

بیواؤں اور ناداروں کے ساتھ ہمیشہ سلوک کرتی رہتی تھیں

خیرات :-

خود کسی وقت کچھ بن نہ پڑتا تھا تو اوروں سے دلا دیتی تھیں۔ قرض اُٹھا کر لوگوں کا قرضۂ حسنہ ادا کر دیتی تھیں۔ غرض لوگوں کی امداد اور حاجت روائی کو ایک فرض واجب التعمیل سمجھتی تھیں اور ان کاموں میں انھیں کسی کے مشکور ہونے کی مطلق خواہش نہ ہوتی تھی۔

یہ خوبیاں اور نیک سیرتیں بی بی اشرف النسا بیگم میں تھیں جن کا مختصراً پیچھے ذکر گزرا۔ وہ ہم مستورات میں اپنے علم اور نیکیوں کے نور سے چاند اور تارے کی طرح چمکتی تھیں۔ افسوس وہ دنیا سے اُٹھ گئیں اور ہمیشہ کے لیے ہم سے جُدا ہو گئیں مگر اپنی نیکیوں اور خوش اخلاقیوں کے ذریعہ سے جو سلوک وہ ہمارے ساتھ کر گئیں وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے اور ہمیشہ ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔ ہم سب کو بھی آگے پیچھے وہاں ہی جانا ہے۔ جہاں وہ گئی ہیں۔ پس اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ان کی طرح ہمارا نام بھی زندہ رہے اور ہمارے مرنے کے بعد بھی بہنیں ہمارے گناہوں کی مغفرت مانگیں اور قرآن مجید پڑھ پڑھ کر بخشیں تو ہمیں بھی ان کی سی نیکیاں کرنی اور بھلائیاں چھوڑ جانی چاہئیں۔ اب میں ان اوراق کو ان چند اشعار پر ختم کرتی ہوں جو مرحومہ کے انتقال پر تہذیب نسواں میں شایع کیے گئے تھے ؎

چرخِ ظالم تھا جو آمادہ ستانے کے لیے
بی بی اشرف سے ہوئی اُلفت بہلنے کے لیے

کیوں ملایا تھا فلک گر اُن سے کرنا تھا جُدا
کیوں ہنسایا تھا ہمیں بس یوں رُلانے کے لیے
طائرِ روح موت ان کا آہ اُڑا کر لے گئی
اور قفس میں ہم کو رکھا غم کھلانے کے لیے
موت نے کس کی سُنی ہے آج تک آہ و فغاں
یہ تو ہے پیدا ہوئی سب کو مٹانے کے لیے
راہیِ ملکِ عدم صد حیف تم تو ہو گئیں
رہ گئے ہم ہاتھ ملتے تلملانے کے لیے
خاک کر دیتا جلا کر دِل کا شعلہ جسم کو
گر نہ آتا سیلِ اشک اس کو بجھانے کے لیے
جو جگہ دیتے تھے تم کو اپنی سر آنکھوں پہ حیف
لے گئے وہ خاک میں تم کو ملانے کے لیے
یہ مقامِ رہ گذر ہے آنے جانے کے لیے
تا کے رہنے کے لیے یا دل لگانے کے لیے
تم تو فانی ہو گئیں ہم بھی فنا ہو جائیں گے
کُلُّ فَانٍ ہے مقرر کل زمانے کے لیے